تحریک اتحاد اسلامی: معاصر علمی وادبی تحریکوں پر اثرات

خالد امین*

تحریک اتحاد اسلامی (Pan-Islamism) انیسویں صدی میں مسلمان ممالک کو انحطاط سے نکالنے کے لیے جمال الدین افغانی نے سلطنت عثمانیہ کی تائید سے شروع کی۔ چوں کہ ہندوستانی مسلمان سلطنت عثمانیہ کی خلافت کو روحانی، سیاسی اور تہذیبی طور پر اپنا رہنما تسلیم کرتے تھے اس لیے یہاں کے مسلم دانش وروں کا بہت بڑا طبقہ تمام تر مسلکی اور علاقائی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اس میں شامل ہو گیا۔

ان دانش وروں میں علما، سیاست دان اور ادیب شامل تھے۔ اس لیے اس تحریک کے اثرات ادبی حوالوں سے بھی موجود ہیں اردو نظم و نثر ہندوستان کی معاصر علمی و ادبی تحریکات نے بھی اتحاد اسلامی کے نظریے کو شعوری طور پر قبول کیا اور اسے مسلمانوں میں عام کرنے کی بھر پور کوشش کی۔ انھیں وجوہات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس تحریک نے مسلمانوں کی ملی تحریکوں پر جو اثرات مرتب کیے اس کا مطالعہ آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

علی گڑھ:

علی گڑھ تحریک اپنی ہمہ گیری اور نئے شعوری اثرات اور مطالبات کے لحاظ سے ہندوستان میں نشاۃ اوّلین کا درجہ رکھتی ہے[۱]۔ اس میں موجود صاحبان علم و فن نے کئی حوالوں سے ہندوستانی مسلمانوں کی فکری تعمیر میں چاہے وہ مقامی سطح پر ہو یا بین الاقوامی سطح پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اس تحریک نے بیرونی دنیا کے اثرات کو جذب کر کے نئی توانائی حاصل کی۔

جس تحریک کو علی گڑھ تحریک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہ اگرچہ سید احمد خان کے انگلستان سے واپس آنے کے بعد ۱۸۷۰ء میں شروع ہوئی، لیکن اس کی داغ بیل وہ پہلے ہی ڈال چکے تھے[۲]۔ اس تحریک سے قبل تحریک مجاہدین، بنگال کی فرائضی تحریک بھی مسلمانوں کی بے داری میں اہم کردار ادا کر چکی تھیں[۳]۔ سید احمد خان چوں کہ انگریزی حکمت عملی کا شکار ہو گئے تھے اس لیے ان کی نگاہ کافی حد تک انگریزوں کے اختلاف کے معاملے میں محدود ہوتی گئی[۴] مگر انھوں نے علی گڑھ تحریک کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ سب سے مقدم یہ کرنا ہے کہ وہ مسلمان رہیں اور مذہب اسلام کی حقیقت

* استاد، شعبۂ اردو، جامعہ کراچی، مقیم کراچی

ان کے دل میں قائم رہے اس لیے ضروری ہے کہ ہم انگریزی تعلیم بھی دیں اور عقائد مذہبی سے بھی روشناس کرائیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو ان کو فرائض مذہبی کا پابند رکھیں [۵]۔

سید احمد خان چوں کہ علمی تحریک کو لے کر اٹھے تھے اس لیے علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں میں علمی شوق کو بڑے پیمانے پر پیدا کیا بلکہ اس کی وجہ سے مسلم قومیت کا سرچشمہ اور مسلمانانِ ہند کی سیاسی، تہذیبی، معاشرتی غرض ہر قسم کی تحریکوں کا مرکز علی گڑھ بن گیا [۶]۔ لیکن یہاں یہ بات اہم ہے کہ سید احمد خان چوں کہ مسلمانوں کے معاملے میں انگریزوں کے ساتھ ساتھ تھے اس لیے انھوں نے ہمیشہ اپنی پالیسی کو سرکار برطانیہ کے رخ پر متعین کیا اور اس کے نتیجے میں انھوں نے یہ بھلا دیا تھا کہ یہی انگریز مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کا خون چوس لینا چاہتے ہیں [۷]۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں میں وہابیوں کے علاوہ جمال الدین افغانی کی انگریز دشمن تعلیمات بھی پھیل رہی تھیں۔ سید احمد خان اور ان کے رفقا جن میں حالی بھی شامل تھے انھوں نے افغانی کے خیالات کی تائید کی انھوں نے سید احمد خان کے اس مشورے کو نظر انداز کر دیا کہ وہ اپنے سیاسی تحفظ کے لیے مقتدر قوتوں سے ہمدردی کریں۔ ان لوگوں کی ہمدردی اسلام کے ساتھ تھی اور یہ لوگ اس کے لیے جاں بازی سے بھی دریغ نہیں کر رہے تھے بلکہ اس میں انھیں ذرا سا شک بھی نہیں تھا کہ اس جدید دور میں سلطان عبدالحمید مسلمانوں کے خلیفہ نہیں ہیں۔ علی گڑھ تحریک سے وابستہ کسی شخص نے بھی سلطنت عثمانیہ اور خلافت پر کسی قسم کے شک کا اظہار نہیں کیا [۸] حتیٰ کہ محسن الملک جو پہلے خلاف تھے مگر بعد میں اس کے حامی ہو گئے۔

اجتماعی طور پر سر سید احمد خان کا رویہ تحریک اتحاد اسلامی کے بارے میں سرکار برطانیہ کے رویے سے ہم آہنگ تھا جب اس وقت برطانوی حکومت خلافت عثمانیہ کی حمایت کر رہی تھی اور سید احمد خان تحریک اتحاد اسلامی کی حمایت کرتے تھے بیواؤں اور یتیموں کے لیے فنڈ جمع کرتے تھے۔ ترکی کی فوجیں جو بلغاریہ میں برسرِ پیکار تھیں ان کے لیے امدادی کام میں انھوں نے حصہ لیا۔ روس اور ترکی کی جنگ ختم ہونے کے بعد ہندوستانی مسلم معاشرے نے عالمی سطح پر حتمی سیاسی کردار ادا کیا۔ اس نے اپنی شناخت اتحاد بین المسلمین کے ذریعے منوائی۔ مسلمانوں کی نئی قیادت جس میں نواب عبداللطیف، سید احمد خان، بدرالدین طیب جی جو کہ برطانیہ کے بھی ہمدرد تھے انھوں نے ترکی کی بھی حمایت کی [۹]۔

سید احمد خان چوں کہ ہندوؤں کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے انھوں نے برطانوی سامراج کا اعتماد حاصل کیا۔ تحریک اتحاد اسلامی کی جو تحریک جنوبی ایشیا سے مشرق وسطیٰ تک پھیل چکی تھی اس تحریک کے تمام لوگ سید احمد خان کے اقدامات کی نہ صرف تعریف کرتے تھے بلکہ ان کی خدمات کو تسلیم کرنے کے علاوہ ستائش بھی کرتے رہے [۱۰]۔ علی گڑھ تحریک اور اتحاد اسلامی کے تعلق سے سید احمد خان کی پالیسی اور نکتہ نظر کا مطالعہ کئی حوالوں سے اہمیت کا حامل ہے۔ معروف محقق عزیز احمد نے اس ضمن میں کئی ثبوت اپنی کتاب برصغیر میں اسلامی کلچر میں فراہم کیے ہیں جن

سے سید احمد خان کی ترکوں سے محبت کی وضاحت ہوتی ہے۔ ۱۸۷۰ء میں سید احمد خان دیگر تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمانوں کی طرح ترکوں کے حامی رہے اسی وجہ سے انھوں نے علی گڑھ میں ترکی ٹوپی پہننے کو مقبول بنایا[11]۔ انھوں نے اپنی کتاب خطبات احمدیہ سلطان عبدالعزیز کو ایک خط کے ساتھ ارسال کی جس کے آخر میں یہ الفاظ موجود ہیں: ''کہ آپ کی سلطنت تادیر قائم رہے اور خلیفہ کے تخت کا دفاع اور اسے مضبوط کرتے رہیں''[12]۔

ترکوں کے حوالے سے سید احمد خان نے کئی مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین میں انھوں نے نہایت ہمدردانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ بعض مقامات پر جب سیاسی محاذ آرائی ترکوں اور برطانویوں میں ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے تو اس موقعے پر سید احمد خان خاموشی کو ترجیح دیتے ہیں انھوں نے اپنے ایک مضمون ترک میں ترکی عورتوں کی صبر و استقامت کی مثال یوں دی ہے۔ ''یونانیوں نے جب ترکی عورتوں پر ظلم کیا۔ امیروں کی عورتوں کو رزیل قوم میں ملا دیا۔ ان کے مرد رشتہ دار ذبح کر ڈالے، تاہم جس صبر و قناعت کے ساتھ ان عورتوں نے اس تکلیف کو گوارا کیا نہایت قابل تعریف ہے''[13]۔

اسی طرح سید احمد خان نے اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ میں ۱۷/مارچ ۱۸۷۶ء کو ایک مضمون ترکوں کی تہذیب کے بارے میں لکھا، جس میں انھوں نے ترکوں کے اخلاق و عادات کی نہ صرف تعریف کی بلکہ ان کے خانگی معاملات کو عالم اسلام کے حوالے سے مثالی قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> جو تہذیب ترکوں کے خانگی معاملات میں ہے اگر اس کو وہ لوگ دیکھیں جو انگشت نمائی کرتے ہیں تو حیران ہو جائیں، ترکوں کو اپنے والدین کا خیال اور ادب بہت رہتا ہے اور یہاں تک کہ حضرت سلطان اپنی والدہ کے رو برو کبھی نہیں بیٹھتے جب تک انھوں نے اجازت نہ دی ہو[14]۔

ترکوں کے متعلق سید احمد خان کا رویہ متضاد رجحانات کا حامل رہا ہے۔ انھوں نے جہاں کہیں بھی ترکوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، وہاں ہمیشہ سیاسی معاملات میں ترکوں کے رویے کو دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے غلط قرار دیا ہے مگر ان کی معاشرت، تہذیب و تمدن اور طرزِ فکر کو قابل تعریف کہا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک قوم جو تہذیبی اور معاشرتی حوالے سے دنیا میں نمایاں خوبیوں کی حامل ہو، تو کیا سیاسی حوالوں سے نکمی ہو گی؟ جیسا کہ سید احمد خان کا ایک مضمون سلطان روم اور ہندوستان کے مسلمان میں ان کے متضاد رویے کی پوری جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ اس مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

> سلطان نے جو یونانیوں پر فتح پائی، اس سے کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا جس کا دل خوش نہ ہوا ہو لیکن جو کچھ ہندوستان کے مسلمانوں نے کیا۔ بلا اجازت اور گورنمنٹ کی مرضی کے اس کو ہم اچھا نہیں سمجھتے[15]۔

اسی طرح انھوں نے ترکوں کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہمدردی میں غازی عثمان پاشا کے کردار کو سراہا ہے۔ اس جنگ میں حکومت برطانیہ کے فراخ دلانہ کردار کی بھی تعریف کی ہے۔ انھوں نے یہ کہا کہ روسی جب قسطنطنیہ کی

دیواروں تک جا پہنچے تھے تو یہ برطانیہ ہی تھا جس کے جنگی جہازوں نے اس کے قدم روکے[16]۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے یونانیوں کی لڑائی میں ادہم پاشا کی دلاوری اور بہادری کی بہت زیادہ تعریف کی ہے جب کہ غازی عثمان پاشا نے اس سے کہیں زیادہ بہادری کا مظاہرہ جنگ پلونا میں کیا تھا اس کی اتنی تعریف کیوں نہیں کی گئی[17]۔ سید احمد خان کا یہ کہنا بھی درست نہیں، اس وقت کے اخبارات و رسائل اور اردو کتابوں کا مطالعہ کرنے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ غازی عثمان پاشا کی بہادری کے گرد ایک اساطیری ماحول قائم ہو گیا تھا خود شبلی جب قسطنطنیہ گئے تو ان کی ملاقات اس بہادر انسان سے ہوئی تھی اردو ادب میں اس شخص کے جرات مندانہ کردار پر کئی ناول اور ڈرامے لکھے گئے۔

سید احمد خان برطانوی پالیسی سے انحراف کرنا کسی صورت گوارا نہیں کرتے تھے اس لیے انھوں نے تحریک اتحاد اسلامی میں ہندوستانی مسلمانوں کے طرزِ عمل کو غلط قرار دیا، بلکہ انھوں نے تو یہاں تک کہا کہ "ترکوں کی فتح کو اسلام کی فتح پکارنا سوائے ناسمجھی کے اور کچھ بھی نہیں ہے[18]۔ جنگ روم و روس کے دوران ملک یمین مضمون میں انھوں نے روسیوں کے کردار کو بہت برا کہا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس لڑائی کی وجہ سے تمام دنیا کے مسلمانوں کو رنج و غم کا سامنا ہے کیوں کہ روسیوں نے جس طرح بلگیریا کے مسلمانوں پر ظلم کیا ہے اور شیر خوار بچوں کو زندہ ان ہی لاشوں میں ڈال دیا کہ وہ چلا چلا کر اور جانوروں کے پنجوں سے زخمی ہو کر سسک سسک کر مر جائیں[19]۔

سید احمد خان کے مضامین کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علمی سطح پر ترکوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے رویوں کا قریبی مشاہدہ کر رہے تھے۔ تحریک علی گڑھ کا دائرہ صرف ہندوستانی مسلمانوں تک محدود تھا، اس لیے سید احمد خان نے ان مضامین کے علاوہ بہت زیادہ عملی جدوجہد اس سلسلے میں نہیں کی۔ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو ترکوں کی اعانت سے نہیں روکا۔ ۲۲ر دسمبر ۱۸۷۶ء کو ترکوں کے یتیموں اور زخمیوں کے لیے چندہ کے عنوان سے مضمون میں ہندوستانی مسلمانوں کو یہ ترغیب دی کہ وہ اس کام میں بھرپور شریک ہوں[20]۔

سید احمد خان چاہتے تھے کہ ترک دوبارہ دنیا میں وہی مقام حاصل کر لیں جو انھیں دنیا میں حاصل تھی۔ چوں کہ مصلحت آمیزی کی وجہ سے یہ بات انھوں نے کھل کر نہیں کی۔ بعض مقامات پر انھوں نے برطانوی رویے پر بھی چوٹ کی ہے انھوں نے مسٹر گلیڈسٹون (William Ewart Gladstone) اور دیگر اراکین برطانیہ کی زبان درازی کو بے جا قرار دیا ہے جو انھوں نے ترکوں کے متعلق اختیار کی ہوئی تھی ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اس پورے عمل سے ہندوستانی مسلمانوں کو رنج ہوا ہے[21]۔ سید احمد خان نے روسیوں کے کردار کو شرم ناک قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ روس نے بلاوجہ سرویا اور بوسنیا جیسے ملکوں میں سازش کر کے بغاوت کروائی اور ہزارہا افراد کا خون بہایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روسیوں کو ترکی کی اسلامی سلطنت اور مسلمانوں سے کس قدر دشمنی تھی یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی روسیوں سے نفرت کرتے ہیں[22]۔

سید احمد خان ترکی کی تنظیماتِ اصلاحات کی بھی حمایت کرتے رہے اپنے دوست محسن الملک کو ایک خط میں سلطان

عبدالمجید، سلطان عبدالعزیز اور سلطان محمود کو سماجی اصلاح کار کے طور پر پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کی اتباع ہندوستان اور اس کے علاوہ کئی اور ممالک میں بھی ہونی چاہیے [۲۳]۔

سید احمد خان کا تحریک اتحاد اسلامی کے ساتھ جو رویہ رہا اس کی ایک مثال Azmi Ozcan نے اپنی کتاب *Pan-Islamism: Indian Muslims, the Ottomans and Britan* میں لکھا ہے کہ احمد حمدی سروانی جو افغانستان کے لیے خلافت عثمانیہ کے مشن کا ایک رکن تھا یہ مشن ہندوستان سے ہوتے ہوئے ۱۸۷۷ء میں افغانستان پہنچا۔ سروانی نے اپنے سفر نامے میں واضح کیا ہے کہ مشن کا وفد سید احمد خان سے سرہند اور دہلی کے درمیان سفر میں ریل کی بوگی میں ملا [۲۴]۔ سر سید احمد خان نے اس وفد کو ایم۔ اے۔ او کالج کا دورہ کرنے کے لیے کہا اور اس وفد نے اس کالج کا دورہ بھی کیا۔ برطانوی وائسرائے لارڈ لٹن (Lord Lytton) کا خیال تھا کہ سر سید احمد شاید مشن کے ساتھ شریک تھے مگر سید احمد خان کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ سید احمد خان نے ترکوں کے ساتھ ہمیشہ ہمدردانہ رویہ اختیار کیا [۲۵]۔ حمدی سروانی کے الفاظ یہ ہیں:

> سرہند سے دہلی کے سفر سے واپسی پر جب ہم ریل میں داخل ہوئے تو ہم نے بوگی میں سفید داڑھی والا مہذب شخص دیکھا۔ حکومت برطانیہ کی جانب سے فراہم کردہ مخصوص ریل میں ایک اجنبی شخص کا داخل ہو جانا ہمارے لیے ہیجان انگیز تھا لیکن تھوڑی دیر میں ہم پر یہ واضح ہو گیا کہ یہ شخص سید احمد خان ہیں جو انگریزوں کے یہاں بھی ایک اچھے عہدے کے حامل ہیں۔ انھوں نے ہمیں مسلم کالج کا دورہ کرنے کے لیے مدعو کیا جسے انھوں نے علی گڑھ میں قائم کیا تھا اور اس کے لیے انھوں نے مجاز اداروں سے اجازت بھی حاصل کی تھی [۲۶]۔

علی گڑھ میں ممالک اسلامیہ کے مشاہیر اہل علم، والیان ریاست، علمی وفود اور دیگر اعلیٰ افسران دورہ کرتے رہتے تھے اور اکثر اہل علم نے وہاں کے طلبہ سے دینی و علمی معاملات پر خطاب بھی کیا کرتے تھے [۲۷]۔ پرنس آف ویلز ۱۹۰۶ء میں اور امیر حبیب اللہ خاں والئی افغانستان ۱۹۰۷ء میں یہاں تشریف لائے [۲۸]۔ امیر افغانستان نے جو طلبہ کے مذہبی عقائد کی طرف سے بہت بدگمان کر دیے گئے تھے انھوں نے چند منتخب شدہ طلبہ کا امتحان لیا اور ان سے بے انتہا متاثر و مطمئن ہوئے۔ اس تاثر اور اطمینان کو اپنی تقریر میں انھوں نے پیش بھی کیا۔ بیس ہزار روپیہ عطیہ اور چھے ہزار سالانہ مستقل امداد مقرر کرنے کے علاوہ طلبہ کے عقائد کی نسبت ایک تحریری سند دستخط کر کے مرحمت کی [۲۹]۔

اسی طرح ۱۹۳۴ء میں امیر البحر رؤف بے کی آمد اس ادارے کا یادگار واقعہ ہے۔ انھوں نے مرحوم عبدالرحمن صدیقی نامی ایک طالب علم کے سکونتی کمرہ نمبر ے میں ممتاز ہاؤس کے دروازے پر ایک یادگاری کتبہ نصب کیا اور یونی ورسٹی کو رؤف بے اسپورٹس چیمپئن شپ کپ دیا [۳۰]۔ عبدالرحمن صدیقی جنگ بلقان کے زمانے میں علی گڑھ سے ترکی چلے گئے تھے [۳۱] وہاں

انھوں نے ڈاکٹر انصاری کے طبی وفد میں بہ حیثیت منیجر کے اپنی خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر انصاری کے طبی وفد کی واپسی کے بعد عبدالرحمن صدیقی قسطنطنیہ میں ٹھہر گئے جہاں انھوں نے مہاجرین کی نوآبادیات سے متعلق کافی کام کیا۔ صاحب موصوف کا شمار ان خوش قسمت اشخاص میں ہوتا تھا جو ایڈریانوپل میں ترکی افواج کے ساتھ فاتحانہ داخل ہوئے تھے۔ ان کے دل چسپ اور معلوماتی مضامین کامریڈ اور ہمدرد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے[۳۲]۔ عبدالرحمن صدیقی لکھتے ہیں کہ:

> تسخیر ایڈریانوپل میں ترکی افسروں کی بہادری اور پابندی فرائض پر سوائے تعریف اور حیرت کے اور کچھ ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ ہم ایڈریانوپل میں صرف چار روز تک ٹھہرے، لیکن اس قلیل عرصے میں، میں نے اس قدر چیزیں دیکھی ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ ان سب کو آپ کے روبرو کس طرح بیان کروں۔ کم سے کم دو یا تین باتیں صاف اور صریح ہیں اول یہ کہ تمام آبادی اپنے بلغاری حاکموں سے سخت عاجز اور نالاں تھی اور یہ کہ انھوں نے نہایت صدق دل سے اور ایمان داری کے ساتھ اپنی رہائی دینے والوں کا استقبال کیا۔ جنھوں نے ان کو خوف اور دیگر تکلیفات سے آزادی دلائی۔ یورپ اور اس کے ماہرین سیاست جس طرح چاہیں فیصلہ کریں لیکن اگر ایڈریانوپل کے باشندوں کی خواہشات کا لحاظ کیا گیا تو وہ یک زبان ہو کر نہایت شکریہ کے ساتھ رحم دل ترکوں کی تائید میں رائے دیں گے جنھیں اس قدر نشانہ الزامات بنایا جارہا ہے[۳۳]۔

انیسویں صدی کے آغاز میں تحریک اتحاد اسلامی کے رجحانات جس تیزی سے منظر عام پر آئے اور علی گڑھ کے طلبہ نے جس پرجوش انداز میں اس میں شمولیت اختیار کی، ان وجوہات میں ہندوستان میں برپا ہونے والے سیاسی واقعات بھی ہیں، جنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ان کے اندر انگریز مخالف رجحانات پیدا ہوئے۔ ان واقعات میں سرفہرست تقسیم بنگال کا کالعدم کیا جانا تھا[۳۴]۔

اس حادثے سے قبل ۱۹۰۵ء کی جاپانی فتح اور روس کے انقلاب کے بعد ایک نئی سیاسی فضا ہندوستان اور بالخصوص ترکی، ایران اور مصر میں پیدا ہوئی۔ چوں کہ شبلی نعمانی اس معاملات سے پہلے ہی اسلامی ملکوں کی سیاحت کر چکے تھے چناں چہ ان کے تعلقات ترکی میں انجمن اتحاد و ترقی اور مصر میں دستور پرست جمال الدین افغانی کے پیروؤں سے مستحکم ہو گئے تھے اسی وجہ سے ۱۹۰۸ء میں جب ترکی میں اتحاد و ترقی کا انقلاب برپا ہوا تو شبلی نعمانی نے اسے سراہا۔ چناں چہ ان روابط کو مضبوط کرنے کے لیے علامہ رشید رضا ہندوستان آئے۔

مسلم لیگ کے اجلاس ڈھاکا کے سلسلے میں علی گڑھ کے بڑھتے ہوئے رجحان کے سامنے محسن الملک بھی لاچار نظر آرہے تھے[۳۵]۔ دوسری طرف علی گڑھ کا نوجوان طبقہ اپنے آپ کو اتحاد اسلام کی تحریک سے جوڑنے کے لیے سرگرم تھا ان نوجوانوں میں محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، آفتاب احمد خاں، مظہر الحق، افضل الحق، ڈاکٹر سید محمود وغیرہ پیش پیش تھے[۳۶]۔

لہٰذا شبلی نعمانی کی بدولت علی گڑھ میں اتحاد اسلامی کی تحریک اور ایران، ترکی، مصر کی قومی تحریکوں سے اتحاد کی صورت نظر آنے لگی۔ یوں سمجھیے کہ ہندوستان کی اسلامی تحریک کا یہ بین الاقوامی محاذ قرار پایا[۳۷]۔ اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ خلافت عثمانیہ کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز ۱۸۹۶ء کی جنگ روم و یونان کے موقعے پر علی گڑھ سے ہی بلند ہوئی تھی چوں کہ برطانیہ کی ہمدردی و اعانت یونان کے ساتھ تھی اس لیے برطانوی حکومت کے مقربین نے خلافت کے مسئلے کو نزاعی صورت میں تبدیل کرنا چاہا۔ سرسید اور ان کے رفقاء میں چند احباب جن میں محسن الملک پیش پیش تھے انھوں نے انکار خلافت پر مضامین لکھے۔ ہندوستان کے کئی علما نے اس جنگ میں اخلاقی اور مالی شرکت کو جہاد سے تعبیر کیا۔ بمبئی کے مسلمانوں نے فتح یونان کی خوشی میں جشن منایا تو سید احمد خان نے اس جشن کی مذمت میں ایک مضمون لکھا مگر علی گڑھ اور مسلمانان ہند نے ان کے نظریات مسترد کر دیے[۳۸]۔

شبلی نعمانی نے ۱۸۹۹ء کے علی گڑھ میگزین میں ایک نامکمل مضمون مسئلہ خلافت پر لکھا جس میں انھوں نے تاریخی حوالے دے کر یہ بات ثابت کرنا چاہی تھی کہ ترکوں کی خلافت تمام عالم اسلام کے لیے کیوں کر درست ہے[۳۹]۔ مولانا حالی کی مسدس نے بھی علی گڑھ تحریک سے وابستہ مسلمانوں کے ملی احساسات میں عالم گیر اخوت کا ایک نیا ولولہ پیدا کیا، ان کی یہ نظم اتحاد اسلامی کی تحریک کا شدید ترین اظہار تھی اور اس نے علی گڑھ کی سیاسی فضا میں برطانوی مخالف جذبات پیدا کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

۱۹۱۲ء میں علی گڑھ کے رہ نماؤں کی یہ کوشش تھی کہ ایم۔اے او کالج کو یونی ورسٹی کا درجہ دیا جائے کیوں کہ اب تک یہ کالج اپنے ارتقائی سفر میں اس مقام کو پہنچ چکا تھا جہاں اسے یونی ورسٹی کا درجہ دے دیا جانا چاہیے تھا، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے علی گڑھ کے رہ نماؤں نے انگریز سرکار کی حمایت کی وکالت کی مگر اس رویے سے بھی مسلمان کافی متنفر ہوئے۔ یہاں تک کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے صفحات میں ایم۔اے۔او کالج کی اس ناکام کوشش کی دو زاویوں سے مذمت کی: ایک تو یہ کہ وفاداری کی سیاست سے مسلمانوں کو کبھی کچھ ملنے والا نہیں ہے دوسرے یہ کہ اس وقت مسلمانوں کو ترکی کی مدد کرنی چاہیے[۴۰]۔ لہٰذا علی گڑھ پر اتحاد اسلامی کے رجحانات نے بہت زیادہ زور پکڑ لیا اور اس پر فیصلہ کن اثر محمد علی جوہر اور کامریڈ کا پڑا[۴۱]۔

جب انصاری وفد نے بلقان کے زخمیوں کے لیے طبی وفد لے جانے کا اعلان کیا تو علی گڑھ کے طلبہ نے گوشت کھانا چھوڑ دیا اور یہ رقم زخمیوں کی امداد و اعانت کے لیے بھیجی گئی[۴۲]۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علی گڑھ کی چار دیواری اتحاد اسلام کے نعروں سے گونج رہی تھی اس وفد میں جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے عبدالرحمن صدیقی کا کردار کلیدی ہے اس کے علاوہ شعیب قریشی، خلیق الزماں، عبدالرحمن پشاوری قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام اصحاب علی گڑھ سے وابستہ تھے[۴۳]۔ نواب وقار الملک نے بھی مختار احمد انصاری کے طبی وفد کی تائید کی اور جب یہ وفد ترکی سے واپس آ رہا تھا تو وقار الملک نے ۲۹

جون ۱۹۱۳ء کے ہمدرد میں ایک مضمون مختار احمد انصاری کی مراجعت پر لکھا۔ اس میں انھوں نے اس عزم کا اظہار کیا کہ جنگ بلقان ختم ہوجانے کے بعد اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ترکوں کی اعانت ختم ہوجانی چاہیے تو یہ بات غلط ہے ان کا یہ کہنا تھا کہ اس عمل کو جاری و ساری رہنا چاہیے کیوں کہ ڈاکٹر انصاری جب دہلی آئیں گے تو ساری صورت حال سے قوم اچھی طرح واقف ہوجائے گی [۴۴]۔

وقار الملک بھی اتحاد اسلامی کے قائل تھے۔ ویسے تو محسن الملک، جن کے دور میں شبلی اور ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں میں ترکی کے لیے جوش و خروش پیدا کر دیا تھا وقتی رجحانات کا ساتھ دینے اور جذبات کے آگے مصلحتوں کو دبانے پر مجبور ہو گئے تھے [۴۵]۔ انھوں نے مسلم یونی ورسٹی کے قیام کے لیے جس میں سیاسی مزاحمت کے باعث تاخیر ہوگئی تھی یونی ورسٹی کے قیام کے لیے جو چندہ جمع کیا گیا اس میں سے ایک ہزار روپیہ ترکی حکومت کے تمسکات خریدنے میں لگا دیے [۴۶]۔

اس دور میں ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے اندرونی اختلافات کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ حکیم اجمل خاں کی کاوشوں سے دیوبند اور علی گڑھ میں اتحاد اسلام کی تحریک کے نتیجے میں اختلافات بہت کم ہو گئے تھے۔ حکیم اجمل نے 'ادارہ نظارۃ المعارف' قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی فارغ التحصیل طلبہ اس ادارے سے دینیات اور عربی کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ حکیم اجمل کے اس منصوبے میں دیوبند اور علی گڑھ شانہ بشانہ تھے۔ حکیم اجمل خاں، قاضی عبدالغفار کے اس ادارے کی سر پرستی دیوبند سے مولانا عبیداللہ سندھی اور علی گڑھ سے نواب وقار الملک کر رہے تھے [۴۷] جن کے اتحاد اسلامی کے رجحانات کا پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے۔

جب مولانا شوکت علی جو خود بھی علی گڑھ تحریک کے رکن تھے، انجمن خدام کعبہ کی تحریک شروع ہوئی تو علی گڑھ کے کئی نوجوان اس میں شریک ہوئے اور جان محمد جونیجو کی طرح اپنی جائے داد بیچ کر افغانستان چلے گئے [۴۸]۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنگ، ترکی اور عالمی طاقتوں کے علاقے میں ہو رہی ہے مگر ہیجان ہندوستان کے مسلمانوں کے دل و دماغ میں بپا ہے کیوں کہ ہندوستانی مسلمان یہ سوچ رہے تھے کہ ترکی جو عالم اسلام کا پایہ ہے وہ عیسائی قوتوں کی وجہ سے امتداد زمانہ کا شکار ہو رہا ہے۔ اس سوچ نے علی گڑھ میں اسلامی جذبات کو انتہا درجے تک ہوا دی اور علی گڑھ تحریک نے مقامیت کے تمام مسائل سے اپنے آپ کو علیحدہ کر کے اپنے رخ کو عالمی سیاست میں ڈھال لیا [۴۹]۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی عالمی سیاست میں دل چسپی نے تقسیم بنگال کو کالعدم کرنے کی راہ ہموار کی۔

جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو ہندوستان کے مسلمانوں کا طرز احساس یہ تھا کہ برطانیہ نے ہی اسے اکسایا ہے [۵۰]۔ کیوں کہ ماضی کے کئی تجربات سے مسلمانوں نے برطانیہ کے کردار پر یقین کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جس طرح ۱۸۷۰ء میں انگریزوں نے روس کے مقابلے میں ترکی کی مدد کی تھی جس سے روسی خطرہ ٹل گیا تھا اس وقت خود انگریزی حکومت نے ہندوستان میں چراغاں کرایا تا کہ مسلمان خوش ہوں۔ لہٰذا طرابلس کی جنگ کے سلسلے میں یہ سمجھنا کہ انگریزوں نے کسی

لاعلمی کی بنا پر اٹلی کو اکسایا، مسلمانان ہند اس عذر لنگ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے[۵۱]۔

حسرت موہانی اردوے معلی کے ایڈیٹر تھے اور علی گڑھ کے طالب علم بھی۔ انھوں نے اپنے رسالے میں انگریزوں کے خلاف نفرت کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کیا اس کے علاوہ وہ خلافت عثمانیہ ہلال احمر فنڈ اور عثمانی ترکوں سے محبت و عقیدت کے نقیب تھے۔ انھوں نے اس رسالے کے ذریعے مسلمانوں میں خلافت عثمانیہ سے ہم دردی پیدا کی اور انگریزوں کی بنائی ہوئی چیزوں کا استعمال نہ کرنے کی تحریک کو تقویت بخشی۔ سودیشی کپڑوں اور کھدر کے کرتوں کی پہلی دوکان انھوں نے رسال گنج میں علی گڑھ میں کھولی اور وہاں کے طلبہ کو بھی ان چیزوں کے استعمال کی ترغیب دی[۵۲]۔

علی گڑھ کے طلبہ روزانہ بعد نماز مغرب مسجد میں جلسے کر کے انگریزوں کے خلاف اپنے جذبات کا برملا اظہار کرتے تھے[۵۳]۔ اس وقت علی گڑھ کے طلبہ کی قیادت نور الدین، پرنس حمید اللہ، عبدالوحید خاں کر رہے تھے ان طالب علموں نے برطانوی قیادت پر کھل کر تنقید کی[۵۴] مثلاً تصدق حسین صدیقی علی گڑھ میں وہ پہلے طالب علم تھے جنھوں نے انگریزوں کے خلاف تقریر کی اور اس تقریر کے نتیجے میں انھیں ایک سال کی سزا ہوئی[۵۵]۔ نینی تال جیل بھیجے گئے۔ علی گڑھ ہی کے ایک طالب علم نثار احمد شروانی نے جو ایس پی کے عہدہ پر فائز تھے ان کے بھائی فدا احمد شروانی نے انگریزی اداروں سے بائیکاٹ کیا[۵۶] اور اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی۔ سید محمود کو بھی مصر کے موضوع پر ایک مضمون لکھنے پر گرفتار کیا گیا اور ۲ سال کی سزا ہوئی[۵۷]۔

ڈاکٹر سید محمود کے قیام برطانیہ کے دوران دو انگریز مؤرخین مسٹر براؤن (Edward Granville Browne) اور ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ (Wilfrid Scawen Blunt) سے ان کے گہرے روابط تھے[۵۸]۔ بلنٹ نے اپنے روزنامچے میں علی گڑھ کے دورے کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں صاحبان اس وقت کے سیاسی حالات پر گہری نظر رکھتے تھے اور دونوں نے جمال الدین افغانی کا ذکر اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ علاوہ ازیں دونوں کے افغانی سے تعلقات بھی تھے۔ علی گڑھ تحریک کی وابستگی اتحاد اسلام سے کچھ اس نوع کی تھی کہ اسے صرف سیاسی تناظر میں ہی نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ علی گڑھ کے مسلمان طلبہ ہمیشہ مسلمانوں کے احساسات و جذبات کی آبیاری میں اپنا کردار ادا کرتے رہے ہیں اس ادارے نے مسلمانوں کی جس طرح ملی خدمت کی ہے، شاید نو آبادیاتی ہندوستان کی تاریخ میں کسی نے بھی علی گڑھ سے بڑھ کر انجام نہیں دی، اس کا متوازی رویہ ڈاکٹر انصاری کے طبی وفد کے وقت دیکھا جا سکتا ہے، اس وفد کو لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند نے خود باریابی کا موقع دیا ایک طرف برطانوی حکومت کا سیاسی کردار یہ تھا کہ وہ خود بلقانی ریاستوں کو ترکی پر چڑھائی کے لیے ہوا دے رہا تھا دوسری طرف طبی وفد کے لیے انگریزوں کا فراہم کردہ ٹرک کاروان انصاری طبی وفد کو خیر باد کہنے کے لیے پیش کیا گیا[۵۹]۔

علی گڑھ تحریک کو سیاسی اور تعلیمی تحریک خیال نہیں کیا جانا چاہیے[۶۰] اس تحریک سے وابستہ افراد اپنے شعبہ زندگی میں

کئی حوالوں سے اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ انگریزی اور ترکی حکومت کے خوش گوار تعلقات کے زمانے میں علی گڑھ میں ترکوں کا لباس اختیار کیا گیا تھا جو یورپ کے لباس اور تمدن سے قریب تر تھا[۶۱]۔ مگر انگریزوں اور ترکوں کے درمیان ۱۸۸۶ء میں اختلال مصر کے حوالے سے جو بدمزگی پیدا ہوئی، سید احمد خان نے اس موقعے پر انگریزوں کی تائید کی اور ان کی تحریک سے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کو جو علی گڑھ کالج قائم کرنے میں ان کے دست راست تھے حکومت کی طرف سے مصر بھیجے گئے اور انھوں نے مصری نوجوانوں کے خیالات انگریزوں کی طرف سے درست کرنے اور سیاسی امور میں لارڈ کرومر (Lord Cromer) کا ہاتھ بٹانے میں نمایاں حصہ لیا جس کے صلے میں انھیں سی۔ ایم۔ جی کا خطاب ملا[۶۲]۔ ان تمام سرگرمیوں کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابتدا ہی سے یہ تحریک مسلمانوں میں عالمی اثرات کی حامل رہی ہے۔

علی گڑھ سے وابستہ ڈاکٹر سید محمود کی انگریزی تصنیف *Khilafat and Islam* اہمیت کی حامل ہے۔ یہ تصنیف اس زمانے میں سامنے آئی جب برطانیہ نے ایران میں بلیو جیکٹ فوج اتار دی تھی۔ ڈاکر سید محمود کو ولفرڈ بلنٹ نے بلایا اور کہا کہ انگریزوں کے اس اقدام کی مذمت کرنی چاہیے۔ چناں چہ ایک احتجاجی جلسہ بلایا گیا۔ جس میں دو ہزار ہندوستانی مسلمان اور انگریز شریک ہوئے۔ سید امیر علی بھی اس وقت برطانیہ میں موجود تھے انھیں بھی مدعو کیا گیا مگر انھوں نے شرکت کرنے سے انکار کر دیا[۶۳]۔ ڈاکٹر سید محمود نے پروفیسر براؤن کی مدد سے ایک ریزولیوشن تیار کر کے بلنٹ کو دکھائی وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے براؤن انگریز کو نہیں جانتا یہ پھسپھسا ہے انگریزوں کی سخت مذمت کرو۔ گالیاں دو تب اس پر اثر ہوگا۔ بہر حال جلسہ ہوا اور ڈاکٹر سید محمود اس جلسے کے روح رواں تھے۔ انھوں نے بلنٹ کی ترمیم کے ساتھ دوسری قرارداد اس جلسے میں پیش کی اور شرکا جلسہ اس سے بے حد خوش ہوئے[۶۴]۔ *Times of London* نے اسے ملک کے شہریوں کی مملکت سے عدم وفاداری قرار دی[۶۵]۔

علی گڑھ کے طلبہ نے جنگ طرابلس میں جس جذبہ اخوت کا اظہار کیا تھا وہ ایک مثال ہے[۶۶]۔ ڈاکٹر سید محمود لندن ہی میں تھے۔ براؤن نے ایک میٹنگ منعقد کی اس میں بلنٹ نے اپنا موقف سخت انداز میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہماری حکومت خود سازشی ہے، یہ خود اٹلی کے ساتھ شریک جنگ ہے ورنہ اگر یہ چاہے تو فی الفور اٹلی کو واپس ہونا پڑے[۶۷]۔ جنگ بلقان سے جب طبی وفد واپس آیا تو ترکی پر پہلی جنگ عظیم میں شمولیت کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ طبی وفد کے اراکین نے ۱۲ جولائی ۱۹۱۳ء کو علی گڑھ میں ایک جلسے میں اپنے سفر کی روداد اور ترکی کے تاثرات سنائے[۶۸]۔ مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، انھوں نے طے کر لیا تھا کہ ترکی میں انگورہ حکومت کی مزید مالی امداد کی جائے تا کہ وہ یونانیوں سے جنگ کر سکیں[۶۹]۔ اس شورش کے زمانہ میں علی گڑھ اور عام ہندوستانی مسلمانوں نے ۱۹۲۱ء میں پرنس آف ویلز کے خیر مقدم کا بائیکاٹ کیا[۷۰]۔

اس زمانے میں حالات اس قدر نازک ہو گئے تھے کہ وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ نے اپنی حکومت کو لکھ دیا تھا کہ اگر

ترکوں کے خلاف پالیسیوں میں ترمیم نہیں کی گئی تو ہندوستان پر حکمرانی دشوار ہو جائے گی[۱]۔ اس پوری سرگرمی کا اثر علی گڑھ میں مسلمان طلبہ میں بالعموم دیکھا جا سکتا ہے مگر علی گڑھ سے وابستہ انگریز اساتذہ کرام بھی ان سرگرمیوں میں کافی دل چسپی لیتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم اول کے چھڑ جانے پر سر والٹر رائے جو انگریزی کے پروفیسر تھے جنگ عظیم اوّل پر انھوں نے متعدد لیکچر دیے جنھیں جمع کر کے ۱۹۱۸ء میں *England and the War* کے عنوان سے شائع کیا گیا[۲]۔

علی گڑھ تحریک نے حقیقتاً تحریک اتحاد اسلامی کے فروغ کے لیے افراد کار ہندوستان میں اور اس سے باہر بھی فراہم کیے۔ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے۔ شوکت علی کو مئی ۱۹۱۵ء میں ترکی کی حمایت میں پہلی بار قید و بند کا مزا چکھنا پڑا۔ شوکت علی نے انجمن خدام کعبہ کی تحریک چلائی جس کے پس پردہ مقاصد میں برطانوی حکومت کے خلاف جہاد بھی شامل تھا[۳]۔

علی گڑھ ہی کے ایک طالب علم راجہ غلام حسین نے زمانہ طالب علمی میں ہڑتال میں حصہ لینے والوں میں شامل تھے اور اتحاد اسلام کے داعی تھے۔ آزادی کی علم برداری میں مسز بیسنٹ کی ہوم رول لیگ کو زور و شور سے چلایا۔ علاوہ ازیں جب مولانا محمد علی جوہر کا کامریڈ اخبار بند ہو گیا تو لکھنؤ سے انھوں نے *New Era* ہفتہ وار پرچہ نکالا جو مکمل طور پر کامریڈ کے طرز کا تھا جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا[۴]۔

علی گڑھ سے طبی وفد میں شریک چوہدری خلیق الزماں صدیقی کی کتاب شاہراہ پاکستان کے مطالعے سے اس زمانے کی علی گڑھ میں تحریک اتحاد اسلامی کے رجحانات کی واضح تصویر کھل کر سامنے آتی ہے۔ نوجوانوں میں یہ جذبہ تھا کہ بلقان جا کر جہاد کریں تاکہ انگریزی سامراجیت سے چھٹکارا ملے جو آئے دن باقی ماندہ مسلمانوں کی سلطنت کو تباہی سے دوچار کر رہی تھیں۔ اسی زمانے میں ہاشمی فرید آبادی نے علی گڑھ کی مسجد میں آ کر اپنی نظم چل بلقان چل سنا کر علی گڑھ کی پوری فضا میں چل بلقان چل کی آرزو جگا دی تھی[۵]۔

علی گڑھ تحریک نے جس طرح مدبر اور منتظم پیدا کیے، اس تحریک نے مسلمانوں کی ملی زندگی میں جس انداز میں اپنے تاثرات ڈالے اس کی مثال اگر تلاش کرنی ہے تو اس تعلیمی ادارے کے بعد مسلمانوں کی زندگی کا تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی انداز میں مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ علی گڑھ نے صرف ہندوستانی مسلمانوں میں حرکت پیدا نہیں کی بلکہ ایسے عزائم بھی تشکیل دیے اور ایسی شخصیات پیدا بھی کیں جنھوں نے اپنے کردار و عمل کے ذریعے شوق، مستعدی، قربانی اور ارادے کی پختگی سے پوری دنیا میں اپنی مثال قائم کی۔ اگر تحریک اتحاد اسلامی کے تناظر میں دیکھا جائے تو حالی، شبلی، وقار الملک ایسے نام ہیں جنھوں نے ملت کی نشو و نما میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں۔ علی گڑھ کا یہ عطیہ پورے عالم اسلام کے لیے ایک روشن مثال ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کا علی گڑھ سے جو دیرینہ تعلق ہے اور اس کو جس طرح وہ اپنی تعمیری صلاحیتوں اقدار اعلیٰ کی پیروی اور وطن اور ہم وطنوں میں دیرینہ یگانگت کا محرک سمجھتے ہیں اور مظہر بھی، اس کی مثال علی گڑھ کے صدر دروازے

وکٹوریہ گیٹ پر وہ عربی اشعار ہیں جو اس ادارے کے قیام کے دن سے آج تک علی گڑھ تحریک کی ترجمانی کرتے چلے آرہے ہیں[76]۔ اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

قوم کے بزرگوں اور معزز لوگوں نے جو غفلت کے اندھیرے میں مثل چراغوں کے ہیں ایک عالی شان مکان بنایا ہے[77]۔

اس کے علاوہ علی گڑھ میں موجود مسجد قرطبہ کی محراب پر دو آیات نقش ہیں ان آیات کا ترجمہ یہ ہے:

اور البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ ﷺ اس میں کھڑے ہوں اس میں ایسے آدمی جو خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتا ہے[78]۔

دارالعلوم دیوبند:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد دارالعلوم دیوبند مسلمانان برصغیر کا علمی اور دینی مرکز بن کر ابھرا۔ اس مدرسے سے نہ صرف مسلمانوں کی دینی تربیت ہوئی بلکہ عالم اسلام میں بھی چند سالوں میں اس مدرسے نے اپنی علمی خدمات کے ذریعے روشن مثالیں قائم کیں اور اس کے طفیل کئی ایسی تحریکیں بھی پروان چڑھیں جنھوں نے دور غلامی میں آزادی کی شمع روشن کر دی۔ تحریک اتحاد اسلامی اور دارالعلوم دیوبند پر اس کے اثرات کا جائزہ لینا مقصود ہو تو علمائے دیوبند کے حالات و واقعات کا بغور مطالعہ کرنا پڑے گا اور صحیح اثرات کے مطالعے کے لیے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی زندگی اور ان عوامل پر نظر ڈالنی ہوگی جس نے دیوبند کو عالمی سیاسی و دینی رجحانات میں ایک ملت کی آواز بن جانے پر مجبور کیا۔ مولانا محمود الحسن اس تحریک کی واحد شخصیت تھے جنھوں نے مسلمانوں کو ترکوں کے ساتھ اعانت کرنے کے لیے نہ صرف ابھارا' بلکہ ایک جمعیت بھی قائم کی جس کا نام ثمرۃ التربیت تھا[79]۔ یہ انجمن خود ایک لائحہ عمل کی خبر دیتی ہے۔ اس انجمن کے قیام کا اصل مقصد بھی یہی تھا کہ تمام انقلابی جماعتیں ایک بنیاد پر اکھٹی ہو جائیں[80]۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے سرحد، افغانستان اور ایران کی حکومتوں کو ایک نظریے پر متفق ہو جانے کی تجویز بھی پیش کی۔ ۱۸۵۷ء سے پیش تر شاہ ایران نے بھی اس کی دعوت دی تھی[81]۔

سول اور سیکولر عوامی اداروں کے برعکس دیوبند کے ذریعے مسلمانوں میں ایک نئی سیاسی سوچ پیدا ہوئی جو صدیوں سے مذہبیات اور مابعد الطبیعیاتی مباحث سے منسلک رہی تھی[82]۔ ان ہی عوامل کی وجہ سے مسلم ہند میں علمائے دیوبند کی جماعت کو نمائندہ حیثیت میں دیکھا گیا جس نے پہلی جنگ عظیم کے دوران ترکوں سے روابط استوار کیے اور ایسی حکمت عملی اختیار کی جو ہندوستان سے برطانیہ کو اکھاڑ پھینکنے پر مبنی تھی[83]۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خلافت عثمانیہ کے اتحادی یعنی ہندوستانی مسلمان برطانیہ کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد کرا سکتے تھے؟ اس گرفت سے نجات پانے کی کوششیں ہندوستان میں کئی مواقع پر دکھائی دیتی ہیں۔ سلطان ٹیپو کی شہادت سے لے کر جنگ آزادی تک ہندوستانی مسلمانوں کی یہ دیرینہ

خواہش تھی کہ وہ برطانوی حکمرانوں سے نجات حاصل کریں اور دوبارہ اپنی ملّی شناخت کو زندہ کریں۔ اس خواہش کے حصول کے لیے بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں کئی مذہبی ادارے بہ شمول دیو بند اور فرنگی محل نے مسلمانوں کی عوامی رائے تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور ان اداروں نے برطانوی سیاسی پروپیگنڈے کی بھرپور مخالفت کی[۸۴]۔

برطانوی حکومت کے سیاسی وتہذیبی پروپیگنڈے کا جواب دینے کے لیے دارالعلوم دیو بند نے شعبہ اشاعت اسلام و صیغہ تالیف دارلعلوم بھی قائم کیا۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ دینی خدمات کو ہر شعبہ زندگی میں جاری کیا جائے۔ وہاں ایسے عالم تیار رہتے تھے جو ہر قسم کی دینی خدمات انجام دے سکتے تھے[۸۵]۔ ہندوستان اور اس سے باہر اشاعت اسلام کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے دارالعلوم دیو بند نے چند علما کی جماعت تیار کی جو اشاعت اسلام کی غرض سے ہندوستان سے باہر بھی اپنے گہرے اثرات رکھتی تھی[۸۵]۔

دارالعلوم دیو بند کا مسلم دنیا کو ایک مرکز پر متفق کرنے سے پہلے ایک قدم جو انقلابی بھی تھا اور وقت کی اہم ضرورت بھی اٹھایا گیا کہ ہندوستان کے تمام مسلمان کسی ایک نکتے پر مرتکز ہو کر عالم اسلام کو ایک مرکز پر جمع کریں۔ اسی مبارک جذبے کے تحت ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر اور ابوالکلام آزاد جیسے مدبرین کو شیخ الہند کا حلقہ بگوش بنا دیا تھا اور کوشش یہ کی جارہی تھی کہ علوم شرقیہ اور علوم مغربیہ کی دونوں عظیم الشان یونی ورسٹیوں یعنی دارالعلوم دیو بند اور علی گڑھ میں مفاد ملت کے اصول پر آئینی اتحاد و اتفاق کا رابطہ قائم ہو جائے[۸۶]۔

سید احمد خان اور دارالعلوم دیو بند میں خواہ کتنا ہی بُعد کیوں نہ ہو، سید احمد خان نے ہمیشہ اسے مسلمانوں کا ادارہ تسلیم کیا اور اس حوالے سے اخلاقی امداد بھی فراہم کرتے رہے۔ مولانا قاسم نانوتوی کے انتقال پر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مؤرخہ ۲۴/اپریل ۱۸۸۰ء میں لکھا ہے کہ:

> دیو بند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگار ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعے سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جمارہے[۸۷]۔

دارالعلوم دیو بند نے مسلمانوں کی سیاسی، معاشی اور تعلیمی بربادیوں کے علاوہ ہندوستان میں مسیحی مشنریوں سے وابستہ پادریوں کی جماعتوں کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا کیوں کہ ۱۸۵۷ء میں سات ہزار علما کو شہید کر دیا گیا یا پھر انھیں جزائر انڈمان میں قید کیا گیا ان اسباب کی روشنی میں مسلمانوں کی دینی محافظت جس انداز میں علمائے دیو بند نے علمی اور تحریکی سرگرمیوں کے تحت کی اس کے اثرات عالم گیر تھے اور اس اثرات نے اس تحریک کو جغرافیائی حدود سے بہت جلد باہر نکال کر عالمی اثرات ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ مدرسہ دیو بند میں فارغ التحصیل طالب علموں میں حریت رچی بسی تھی۔ ہندوستان سے برطانوی سامراج کو نکالنے کی خواہش ہندو کانگریسیوں کی خواہش سے فایق تھی کیوں کہ انگریزوں کا ہندوستان چھوڑنا فقط ہندوستان چھوڑنا نہیں تھا تمام اسلامی ملکوں میں جو انگریزوں کے پنجہ استبداد میں گڑے ہوئے تھے اس سے گلو خلاصی

تھی[۸۹]۔

علی گڑھ اور مدرسہ دیو بند کے دل ملت کے ساتھ دھڑکتے تھے۔ ترکی پر آفت آئی تو ادھر نواب وقار الملک بہادر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر انگریز حکومت نے مسلم یونی ورسٹی بنانے کی اجازت نہ دی تو جو روپیہ مسلم یونی ورسٹی کے واسطے جمع کیا گیا ہے سارا ترکی روانہ کر دوں گا۔ ادھر مولانا محمود الحسن نے ترکی سے جس جذباتی اور عملی اور والہانہ محبت کا اظہار کیا وہ دیو بند تحریک کی ایک تاریخ ہے[۹۰] جو ہندوستانی مسلمانوں کی عالم اسلام سے وابستگی کی روشن دلیل ہے۔

مولانا محمود الحسن تحریک اتحاد اسلامی کے لیے عملی طور پر سرگرم رہے تھے۔ جنگ بلقان میں مولانا نے نہایت بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیو بند کے مدرسے میں طلبہ کی چھٹی کر دی اور مدرسین کو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بھیجا کہ وہ ترکوں کی امداد کے لیے چندہ اکٹھا کریں اس پر مستزاد یہ کہ مدرسین سے بھی درخواست کی کہ وہ اپنی تنخواہوں میں سے ترکوں کے لیے انفاق کریں۔ اس طرح تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ ترکی بھیجا گیا۔ جس کے صلے میں ترکی حکومت نے آپ کا شکریہ ادا کیا اور وہ رومال جس میں آں حضرت ﷺ کا پیراہن مبارک رکھا رہتا ہے دارالعلوم دیو بند کو بہ طور تبرک اور عطیہ بھیجا جو آج بھی دارالعلوم دیو بند کے خزانے میں تبرکاً موجود ہے[۹۱]۔

جنگ بلقان کے دوران مولانا محمود الحسن نے ترکوں کی امداد کے متعلق ایک فتویٰ بھی دیا جس میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس بات کی تاکید کی گئی کہ معرکہ بلقان میں ترکی مجروحین و یتیموں و بیوگان اور ترکی لشکر کی مدد کی جائے۔ صرف مولانا محمود الحسن نے فتویٰ نہیں دیا تھا بلکہ خلافت عثمانیہ کے حوالے سے لاکھوں کی تعداد میں فتاویٰ اور اشتہار چھپوا کر ملک کے گوشے گوشے میں پہنچائے گئے۔ اساتذہ اور طلبہ نے ملک کے اطراف و جوانب میں دورے کر کے عام جلسوں میں اس کی اہمیت بیان کی اور امدادی تحریک کو پورے ہندوستان میں پھیلا دیا گیا۔ جگہ جگہ انجمن ہلال احمر کی امداد و اعانت کے لیے جو انجمنیں قائم ہوئیں ان کے ذریعے دیو بند کے طلبہ و اساتذہ نے لاکھوں روپیہ چندہ کر کے بھیجا۔ اس کے علاوہ خود طلبہ نے اپنی حمیت ملّی کا یہ ثبوت دیا کہ سالانہ انعام میں ملنے والی کتابوں کی پوری رقم ہلال احمر کی نذر کر دی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کیا کہ ضروری استعمال کی اشیا تک چندے میں دے ڈالیں۔ اس امدادی سرگرمی کے علاوہ ان حضرات کی کوششوں سے ملک کے مختلف مقامات سے چندہ کر کے بھیجا گیا، خود ان کے ذاتی چندوں اور دیگر عطیات سے ۶۵ ہزار کی گراں قدر رقم دارالعلوم دیو بند سے روانہ کی گئی[۹۲]۔

دارالعلوم دیو بند تحریک کے عالمی اثرات صرف تحریک اتحاد اسلامی سے وابستگی کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ علمی خدمات میں اس ادارے نے جو کام کیا اس کو نہ صرف سراہا گیا بلکہ اس نے عالمی سطح پر اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں مصر کے مشہور عالم سید رشید رضا ہندوستان میں تشریف لائے تو ہندوستان کے کئی علمی اداروں جن میں علی گڑھ، ندوۃ العلما اور دیو بند شامل ہیں دورہ کیا۔ دیو بند کے دورے کے بعد رشید رضا بمبئی چلے گئے جہاں پہنچ کر انھوں نے دیو بند کے مہتمم

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا[۹۳]۔ رشید رضا نے اس خط میں اس تعلیمی ادارے کو مسلمانانِ ہند کا اسلامی مرکز قرار دیا۔ انھوں نے وہاں کے طالب علموں اور اساتذہ کے خلوص کو دیکھ کر دارالعلوم دیوبند کی تحریک سے نہ صرف دل چسپی لی بلکہ اس امر پر شدید زور دیا کہ مسلمانوں کی دینی، علمی، ادبی اور تہذیبی تربیت کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ ادارہ دین اسلام کی محافظت میں اپنا کردار ادا کرے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان میں افسوس ناک امر یہ ہے کہ غریب مسلمان بھیڑ بکریوں سے زیادہ مہمل چھوڑ دیے گئے ہیں، ہم میں سے کوئی شخص ان کی خبر نہیں لیتا، اور ان کی حالت نہایت قابل رحم ہوگئی ہے۔ ان لوگوں کی ہدایت کا کون متکفل ہوسکتا ہے؟ آپ یا آپ جیسے علما کرام سے امید کی جا سکتی ہے کہ اسے مسلمانوں کی ہدایت اور تلقین کے لیے ایک تحریک اور ایک ادارے میں ڈھال دیں اور مسلمانوں کی ہدایت کے لیے کمر بستہ ہوں اور ان کے متعلق کوئی مستقل انتظام کریں[۹۴]۔

رشید رضا نے ہندوستانی علما سے کہا کہ پورے عالم اسلام کی حالت تقریباً یکساں ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ مصر اور ہندوستان کے مسلمان متفق ہو کر علمی افلاس کو دور کرنے کی کوشش کریں کوئی ایسا انتظام ہو کہ آپ ہماری تجاویز سے واقف ہوں اور ہم آپ کے قیمتی مشوروں سے فائدہ اٹھائیں[۹۵]۔

۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان کے نتیجے میں مولانا محمود الحسن نے سفر حجاز کا ارادہ کیا۔ اس سفر میں حکیم عبدالرزاق، ڈاکٹر انصاری نے بہت زیادہ مدد دی۔ حکیم عبدالرزاق نے جائے قیام اور ٹکٹ وغیرہ ہر قسم کا سامان سفر نہایت فراخ دلی سے مہیا کیا[۹۶]۔ مولانا محمود الحسن نے مکّہ معظم میں وہاں کے گورنر غالب پاشا سے ملاقات کی اور اپنا تعارف کرایا۔ غالب پاشا نے شیخ الہند کو ایک مکتوب بصری پاشا گورنر مدینہ منورہ کے نام لکھا جس میں انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات کرنے کی تفصیل موجود تھی۔ مدینے میں ان دونوں صاحبان سے شیخ الہند کی ملاقات ہوئی جن کی تفصیلات سفر نامہ شیخ الہند میں دیکھی جاسکتی ہے[۹۷]۔

انور پاشا اور جمال پاشا سلطنت عثمانیہ کے اہم افراد میں شمار ہوتے ہیں۔ انور پاشا تمام محاذوں کی محافظت کہ نہ صرف ذمہ دار تھے بلکہ اپنے محاذ کی خبر گیری بھی کرتے رہتے تھے۔ شیخ الہند کا مدینہ منورہ میں نہایت شان دار استقبال کیا گیا جس میں اہل شہر کے تمام مذہبی اور دینی طبقات نے شرکت کی[۹۸]۔ اس ملاقات میں جمال پاشا نے آزادی کی تحریک کو ہندوستان میں جاری رکھنے کی تلقین کی اور سلطنت عثمانیہ کی جانب سے یقین دلایا کہ ہم اہل ہند کی آزادی کے لیے پوری جدوجہد عمل میں لائیں گے[۹۹]۔ انور پاشا نے چند خطوط دیے جن میں آزاد قبائل کو امداد دینے کا اطمینان دلایا گیا تھا[۱۰۰]۔

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم اوّل چھڑ گئی۔ مولانا محمود الحسن کا منصوبہ یہ تھا کہ برٹش حکومت پہ کاری ضرب لگانے کا یہ بہترین موقع ہے۔ مولانا یہ سمجھتے تھے کہ اس سے آزادی کی منزل نہایت قریب آجائے گی۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے مجاہدین کے مرکز یاغستان کو جہاں مولانا سیف الرحمن، حاجی ترنگ زئی وغیرہ موجود تھے اور عرصے سے اس جماعت کی ضروریات

پوری کر رہے تھے، پیغام بھیجا کہ اب سکون کے ساتھ کام کرنے کا وقت نہیں ہے، سر بکف ہو کر میدان میں آ جانا چاہیے[۱۰۱]۔ غازی انور پاشا سے ملاقات انگریزوں کے خلاف کارروائیوں کے تیز کرنے کے منصوبے کو ذہن میں لے کر شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے مناسب یہ جانا کہ وہ خود آزاد قبائل کے پاس پہنچیں۔

اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی رومال خطوط کے واقعات کا انکشاف ہوا اور حکومت برطانیہ کو اس سازش کا علم ہوا[۱۰۲]۔ اس منصوبے کو مضبوط اور قابل عمل بنانے کے لیے مولوی عبید اللہ سندھی نے اپنے تین ساتھیوں عبداللہ، فتح محمد اور محمد علی کے ساتھ اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحد کو پار کیا۔ عبید اللہ دیو بند ضلع سہارن پور کے مدرسے میں تعلیم مکمل کر کے مولوی بنے۔ وہاں انھوں نے اپنے باغیانہ خیالات اور برطانیہ کے خلاف جہاد کو چند مدرسین اور طلبہ میں بھی پھیلا دیا، جن لوگوں پر انھوں نے اپنا اثر ڈالا ان میں سب سے بڑی شخصیت مولانا محمود الحسن کی تھی۔ مولانا عبید اللہ چاہتے تھے کہ دیو بند کے مشہور و معرف فارغ التحصیل مولویوں کے ذریعے ہندوستان میں ایک عالم گیر پان اسلام ازم کی تحریک چلائیں[۱۰۳]۔

یہاں اس بات کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ گورنر حجاز نے شیخ الہند کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ہندوستان میں عام ہندوستانیوں کو متحد کر کے آزادی کی تحریک کا راستہ ہموار کریں۔ سید حسین احمد مدنی نے اپنی کتاب نقش حیات میں شیخ الہند کی تحریک کو ہندو مسلم اور سکھوں کے اتحاد سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی تھی جس میں ان کا تجزیہ ان کے نظریات کے طابع معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس تحریک کو عالم اسلام سے وابستہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ترکی کی خلافت اور برطانوی راج کے خلاف جدجہد کو استوار کرنے کے لیے عالمی سطح پر جو کوشش مولانا محمود الحسن نے انجام دی اسے بھی اتحاد اسلامی کے زمرے میں شامل کیا جانا چاہیے۔ اگر ہندوستانی مسلمانوں کا رشتہ عالمی سطح پر نہیں تھا تو پھر اس تحریک کو مضبوط کرنے کے لیے جمال پاشا اور غالب پاشا نے اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کیوں کیا؟

مولانا عبید اللہ سندھی نے مولانا محمود الحسن پر جس طرح اپنے اثرات مرتب کیے[۱۰۴] اس نے دیو بند میں بے چینی پھیلا دی۔ عبید اللہ سندھی کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ دیو بند کو اپنے کام کا ہیڈ کوارٹر بنائیں گے[۱۰۵]۔ اور اتحاد اسلامی اور برطانیہ دشمنی کی اپنی اس تحریک کو ان مولویوں سے کام لے کر پورے ہندوستان میں پھیلا دیں گے جو دیو بند کے مدرسے میں تعلیم پا کر مذہب اسلام کے پرچار اور تبلیغ کے لیے ہندوستان میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ۱۹۰۹ء میں جمعیۃ الانصار بھی قائم ہوئی اس کو دیو بند کے قدیم طلبہ نے کامیاب بنایا[۱۰۶]۔

مسلم ہند میں علمائے دیو بند کی اس جماعت نے جنگ عظیم اوّل میں عثمانیوں سے روابط کی حکمت عملی تیار کی اور سرحدی قبائلیوں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ برطانوی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے میں وہ علماء کا ساتھ دیں[۱۰۷]۔ علمائے دیو بند نے برطانوی حکومت کو صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ عالم اسلام میں بھی پوری قوت کے ساتھ جواب دینے کی کوشش کی اور اس کے نتیجے میں تحریک ریشمی رومال وجود میں آئی۔ شریف حسین مکہ کی بدعہدی کے نتیجے

میں یہ تحریک کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکی ورنہ برطانوی حکومت کو جنگ عظیم اوّل میں ہی ہندوستان کا ایک نیا اور گرم محاذ کھلا ہوا ملتا اور شاید اس کے نتائج خلافت عثمانیہ کی بقا کی صورت میں ظاہر ہوتے۔

جنگ بلقان کے دوران ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں جو طبی مشن بھیجا گیا اسے علمائے دیوبند کی سر پرستی حاصل تھی۔ کیوں کہ اس جنگ میں جو بھی مالی امداد ہو رہی تھی اس کے حوالے سے مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کا فتویٰ موجود ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی اپنے فتوے میں لکھتے ہیں کہ:

> اس میں شک نہیں کہ یورپ کی واحد اسلامی سلطنت پر ریاست ہائے متحدہ کے ظلم اور تعدی کے حملوں نے مسلمانان عالم کو ہی نہیں ہلایا بلکہ رحم دل انصاف پسند غیر مسلموں کے دلوں میں بھی ہمدردی کا جوش پیدا کر دیا ہے[۱۰۸]۔

جنگ بلقان کے دوران دارالعلوم دیوبند نے صرف چندہ اکٹھا نہیں کیا۔ بلکہ ۱۸۷۸ء۔۸۸ء کی جنگ روس و روم کے موقع پر بھی چندہ جمع کرنے کی سعی کی اور لاکھ روپیہ بمبئی کونسل کے ذریعے اس جنگ میں پہنچایا تھا[۱۰۹]۔ تحریک اتحاد اسلامی ہندوستان میں حقیقی معنوں میں اتحاد بین المسلمین کی روح کے ساتھ اپنے زمانے میں موجود تھی۔ اس کی اعلیٰ مثال شیعہ دانش وروں کی تحریریں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ انھوں نے ہر جگہ خلافت عثمانیہ کی نتیجہ خیز حمایت کی جسے امیر علی نے شیعی اماموں کی معصوم روحانی امامت اور پوری مسلم قوم کی دینی یا دنیاوی خلافت کی شاہانہ قیادت کو باہم موافق اور متجانس قرار دیا [۱۱۰]۔ جب کہ ۱۸۷۹ء میں شیعہ بوہرہ رہ نما بدرالدین طیب جی نے بمبئی گزٹ میں ایک خط لکھا اور اس میں برطانوی اخبارات کے ان مفروضوں پر مبنی الزامات کی تردید کی جو انھوں نے بلغاریہ پر ترکی کے نام نہاد مظالم کے ضمن میں لگائے تھے اور ملکہ وکٹوریہ سے درخواست کی وہ روس کے مقابلے میں ترکوں کا ساتھ دیں[۱۱۱]۔ اسی طرح مولوی چراغ علی نے اپنی سیاسی و مذہبی اصلاحات کے سلسلے میں اسلامی سلطنتوں میں ترکی کو شیعی فارس سے بہتر سمجھتے تھے۔ ۱۸۸۶ء میں سر سید احمد خان کے خیالات کے خلاف انھوں نے عثمانوی خلافت کا دفاع کیا۔ وہ بلنٹ کے خیالات کے مخالف تھے کہ خلافت خاندان قریش کو منتقل کر دی جائے[۱۱۲]۔

ترکی میں دستوری حکومت کے قیام کے بعد انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان نے ۱۹۱۱ء میں ایک کانفرنس سالو نیکا (Solonica) میں منعقد کی اور اس میں طے کیا گیا کہ تمام ممالک اسلامیہ کے مندوبین ہر سال قسطنطنیہ میں مجتمع ہو کر ان مسائل پر بحث کریں گے جن کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔ اتحاد اسلامی کے سفراء پھر ان سب ملکوں میں بھیجے گئے جہاں کے مسلمان یورپین حکومتوں کے ماتحت تھے نیز ان ملکوں میں جہاں مسلمان مغربی تسلط سے ابھی آزاد تھے، سنی، شیعہ کے اختلافات کو دور کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ چناں چہ متعدد عثمانی اور ایرانی علماء نجف میں جمع ہوئے اور بیان شائع کیا کہ دونوں فرقوں میں کوئی اختلاف نہیں اور دونوں سلطنتوں کے باہمی تعاون اور اشتراک عمل پر زور دیا اس کے بعد ستمبر ۱۹۱۱ء

میں جنگ طرابلس اور اکتوبر ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان شروع ہوگئی۔ ترکی جو خلافت اور تحریک اتحاد اسلامی کا مرکز تھا اب تمام دنیائے اسلام کی ہمدردی کا مرکز بن گیا اور کئی ملکوں کے اخبارات نے اتحاد اسلامی کی ضرورت اور اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس تحریک میں شعوری طور پر حصہ لیا تھا"[۱۱۳]۔ ان ساری کوششوں کی وجہ سے ہندوستان میں شیعہ اور سنی بھی اس معاملے میں یکجا دکھائی دیتے ہیں۔

مولانا محمود الحسن کے روابط صرف ہندوستانی مسلمانوں سے نہیں تھے بلکہ جب وہ مالٹا میں اسیر تھے تو غازی انور پاشا کے والد غازی احمد پاشا التوائے جنگ کے بعد استنبول میں موجود تھے اور جب قسطنطنیہ پر اتحادی قبضہ ہوگیا تو انھیں شیخ الاسلام خیر الدین آفندی، حبیب بے، کرنل جواد بے، فائق بے، مفتی حسن فہمی وغیرہ کے ہمراہ گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔ یہاں مولانا محمود الحسن پہلے سے موجود تھے مولانا کے متعلق جب انھیں معلوم ہوا تو ان سے بے حد عقیدت ہوگئی۔ اس محبت نے یہاں تک تعلق بڑھا دیا کہ شیخ الاسلام خیر الدین آفندی نے مولانا سے بیعت کی درخواست کی مگر مولانا محمود الحسن نے عجز و انکسار کی بنا پر اسے قبول نہ کیا"[۱۱۴]۔ کرنل جواد بے نے بطور یادگار ایک حمائل شریف نہایت عمدہ اور خوب صورت طبع شدہ مولانا کی نذر کی۔ غازی احمد پاشا معمر اور سادہ آدمی تھے۔ لیکن مولانا سے انھیں بھی بے حد عقیدت تھی وہ مولانا محمود الحسن کے پاس جیل میں تشریف لایا کرتے تھے"[۱۱۵]۔

۱۹۱۴ء میں یورپ کی عالم گیر جنگ شروع ہوگئی۔ ترکی جنگ سے علیحدہ رہنا چاہتا تھا لیکن اس نے جرمنوں کا ساتھ دیا۔ اس جنگ میں ترکوں نے آبنائے باسفورس اور درہ دانیال کو دشمن کے جہازوں کے لیے بند کر دیا تھا۔ برطانیہ اور فرانس نے اس کو کھولنے کے لیے کئی حملے کیے مگر انھیں مسلسل ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا محمود الحسن نے اس واقعے کی تاریخ بھی نکالی ہے جو ۱۳۳۴ھ ہے۔ یہ سنہ ہجری ۱۹ نومبر ۱۹۱۵ء کو شروع ہوا تھا"[۱۱۶]۔ اس موقعے پر شیخ الہند نے ایک نظم درہ دانیال بھی لکھی[۱۱۷] جس کے چند اشعار یہ ہیں:

کیا کہوں اللہ اکبر کیا ہے درد شان نیل
سجدہ گاہ اشقیا ہے درد شان نیل
رستم و سہراب کے قصے ہیں تقویم کہن
ہم سے سن لے کوئی آ کر داستان دردنیل [۱۱۸]

پھر ترکوں کی بہادری اور جفاکشی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

دم کے دم میں ہوگئی کیسے خزاں رشک بہار
کون ہے ہم کو بتا دو باغ بان دردنیل
دیکھ لیوے طلعت وانور کو آ کر یک نظر

دیکھنے ہوں جس کو شیران نیستانِ دردنیل[119]

اہل یورپ کی ملک ہوس گیری پر اس انداز میں تنقید کی ہے اور انھیں اسلامیوں کا دشمن قرار دیا ہے:

روس محسود فرانس اور وہ محسودِ فرنگ
رحمت باری سدا ہو سایبان دردنیل
بھیڑیے یورپ کے بسم اللہ آئیں شوق سے
حب اسلامی سے جو ہوں مدح خوان دردنیل
کٹ کے سر انگریز کا تاریخ نکلی بے بدل
سجدہ گاہ اشقیا ہے آستان دردنیل[120]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد ہندوستانی مسلمان تہذیبی اور فکری اعتبار سے پسماندگی کا شکار ہو گئے تھے اور انگریزوں نے اس موقعے کو غنیمت جان کر عیسائیت کو پروان چڑھانے کے لیے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تبلیغ کے لیے عیسائی پادریوں کو بھیجنا شروع کر دیا۔ مسلمان علماء اس صورت حال سے اچھی طرح واقف تھے انھوں نے اس مہم کو جس کی سرپرستی خفیہ طور پر برطانوی حکومت انجام دے رہی تھی روکنے کے لیے مناظرہ شروع کر دیا، یہ مناظرہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں ہوا کرتا تھا اگر اس مناظرے کی تاریخ مرتب کی جائے تو یہ نہایت وقیع تحقیقی مطالعہ ہوگا۔

دارالعلوم دیوبند نے بھی عیسائی مشنریوں کو روکنے کے لیے نصاب تعلیم کو عربی اور فارسی زبان میں جو اس وقت کی علمی زبان تھی اختیار نہیں کیا بلکہ ہندوستان کے طول و ارض میں بولی اور سمجھے جانی والی زبان اردو کو ہی اپنے نصاب میں اوّلین جگہ دی[121]۔ حالات کے تناظر کو سمجھتے ہوئے اکابرین دیوبند کا یہ فیصلہ نہایت دوررس تھا۔ اس فیصلے نے ہندوستان کی مسلم تاریخ میں اسلامی ادب کی نہایت جامع راہ ہموار کی اور اسلامی علوم کی اشاعت بھی پہلے سے کہیں زیادہ ہونے لگی بلکہ کئی اہم کتابوں کے تراجم بھی ہوئے جس سے اسلامی ادب میں اردو زبان کی ترویج کا معیار بہت بلند ہو گیا۔

اردو زبان و ادب کے حوالے سے دیوبند کی تحریک نے کئی اہم انقلابی اقدامات کیے۔ مولانا قاسم نانوتوی کی اردو تصانیف، مجموعۂ مکاتیب اور البیلی شاعری اردو زبان کے توسیعی پروگرام کا حصہ تھیں[122]۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی سوانح جو اوّلین صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند تھے مولانا قاسم نانوتوی کی سوانح اس وقت لکھی جب اردو زبان میں سوانحی مواد کی مثالیں محدود تھیں[123]۔ مولانا مظہر الدین جو دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور دلّی سے الامان اخبار نکالتے تھے انھوں نے ترکی کے کئی ناولوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا[124]۔

دارالعلوم دیوبند کی اردو ادب کے فروغ میں کی جانے والی کوششیں مطالعے کی متقاضی ہیں۔ برما، بنگال، دکن، رنگون، کابل، بخارا، ایران، ساٹرا، جاوا، کشمیر اور دیگر اسلامی ممالک سے جو طالب علم بھی تحصیل علم کی غرض سے ہندوستان

آتے تھے انھیں اردو زبان لازماً سیکھنی پڑتی اور چوں کہ یہ صاحبان یہاں کے علمی کاموں سے استفادہ بھی کرتے تھے اس لیے اردو زبان سے اچھی واقفیت بتدریج ان میں پیدا ہو جاتی تھی[۱۲۵] جس کی وجہ سے اردو کی ترویج واشاعت اسلامی ملکوں میں ہوئی اور عالم گیر اتحاد اسلامی کے تصورات کو پہنچنے کا بہترین موقع ملا۔ اس دور میں اردو زبان اشاعت اسلام کا باعث بنی اور اعلیٰ درجے کی مذہبی کتابوں کے تراجم ہوئے۔ یہ زبان خاص طور پر مذہبی ادب کی زبان تھی۔ اس ادب نے ایک ایسی مثال قائم کی جس سے اردو نثر کو فروغ ملا۔ اس دور کے اردو اخبارات سادہ نثر کی مثال فراہم کرتے ہیں۔ مذہبی رسالوں میں اردو میں تبصرے بھی کثرت سے ہوا کرتے تھے[۱۲۶]۔ ۱۸۷۰ء میں اودھ اخبار لکھتا ہے کہ "مذہبی کام جس کا عرصہ پچاس سال پر محیط ہے ان سب کو اردو میں جمع کر لیا گیا ہے"[۱۲۷]۔

اردو زبان کو علما نے اس لیے بھی استعمال کیا کہ یہ زبان عوام کے وسیع طبقے میں فارسی کی نسبت زیادہ سمجھی جاتی تھی۔ تعلیم یافتہ افراد اردو جانتے تھے جو صاف ستھری اور شستہ ہوتی تھی۔ جو مسلمان دربار سے وابستہ تھے وہ تو فارسی اور رسمی طرز گفتگو کو جیسا کہ انھوں نے ان اسالیب کو خود فارسی میں ڈھالا تھا بیان کرتے تھے[۱۲۸]۔ لہٰذا دارالعلوم دیوبند سے رسالہ القاسم اور الرشید کا بھی اجرا کیا گیا جو اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ جب سرکاری سطح پر عدالتوں سے فارسی زبان کا خاتمہ کر دیا گیا تو علماء نے اس صورت حال میں دیگر افراد کی طرح دھمکی آمیز ردعمل کا اظہار نہیں کیا، انھوں نے اپنی ثقافتی، سیاسی اور مذہبی حیثیت کو اردو کے استعمال کے فروغ میں اہم جانا۔ انھوں نے نہ صرف علمی و عملی انداز میں اپنے نقطۂ نظر کو اس زبان میں فروغ کے لیے استعمال کیا بلکہ اس خطے کے مسلمانوں کو یکجا کرنے کے لیے بھی اس زبان کا استعمال کیا تھا۔ اس مکتب فکر کے علما جن طالب علموں کو اردو پڑھاتے تھے وہ ایک تحتی یا دوسری زبان بولتے تھے۔ جس کی وجہ سے مذہبی اشرافیہ کے مابین ابلاغ کی بنیادیں اردو زبان میں رکھی گئیں۔ اس کے بعد ان علماء کرام کے شاگرد اپنے علاقوں میں پہنچ کر اردو کی تدریس کا کام کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں کے تمام طبقات میں انیسویں صدی اور اس کے بعد اردو زبان کو وسیلہ اظہار بنانے کے حوالے سے ایک شعوری تبدیلی نظر آتی ہے[۱۲۹]۔ اردو کے استعمال نے ایک ایسا پراثر ثقافتی ماحول پیدا کیا جو صرف مسلمانوں تک محدود تھا اور اردو ایسی علامت کے طور پر ابھری جس سے ہندوستان میں مسلمانوں کی شناخت ظاہر ہوتی تھی۔ اردو کے اس کردار کو مستحکم بنانے میں علما اور دوسرے طبقات کی تصنیفات اساسی نوعیت کی حامل رہی ہیں[۱۳۰]۔

علما کرام نے اتحاد بین المسلمین کی تحریک کو ہمیشہ مدنظر رکھا۔ اور دیوبند کی تاریخ تو اس مساعی سے بھری پڑی ہے لیکن سیاسی کوششوں کے علاوہ ادبی کاوشیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ انھیں میں ایک ڈائری مولانا جناب محمد صادق صاحب کی بھی ہے جس میں دارالعلوم دیوبند کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پرانے زمانے کی ڈائریاں مخصوص انداز کی ہوتی تھیں۔ اکثر اہل ذوق ڈائری یا بیاض لکھتے تھے۔ جس میں کچھ

خاندانی حالات، روزمرّہ کے واقعات اور مختلف چیزیں ہوا کرتی تھیں۔ذکر صادق بھی اسی طرز کی ایک بیاض ہے جس کا نام بھی بیاض صبح صادق ہے[۱۳۱]۔

صبح صادق میں جنگ آزادی کے سلسلے میں سیاسی نظمیں ہیں۔جو مولانا صادق صاحب کی کہی ہوئی ہیں۔ادب تخلص تھا۔ان اشعار میں زیادہ تر یونان و ترکی کی لڑائی کا ذکر ملتا ہے۔روس و انگلستان سے نفرت کا اظہار ہے، آزادی حاصل کرنے کا جوش و جذبہ ہے۔پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں خلافت عثمانیہ کے تحفظ اور ارتقا کے لیے برعظیم پاک و ہند میں جو تحریک اتحاد اسلامی چلی اس کے حوالے بھی اشعار میں دیکھے جا سکتے ہیں [۱۳۲]۔

جنگ کرنا ترک سے کب جرات تھی یونان کی
یہ تو جو کچھ بھی ہے سب سازش ہے انگلستان کی
ہے ہر اک فرعون ظالم کے لیے موسیٰ ضرور
ترک لے لیں گے یقیناً سلطنت یونان کی [۱۳۳]

اس نظم میں ترکوں کے ساتھ جس والہانہ انداز میں مولانا صادق نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا اس سے اُس وقت کے دیوبند مدرسے کی عالمی دلچسپی کا بھرپور اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔انھوں نے عثمانوی خلافت کے حوالے سے برطانوی سازش کا ذکر جابجا کیا ہے اور ترکوں کی جفاکشی و بہادری کا ذکر اپنی نظم میں مختلف جگہوں پر کیا' ایک جگہ کہتے ہیں:

آرہا ہے طیش میں ترکوں کا لشکر اس طرح
کل کوسن لینا حکومت مٹ گئی یونان کی
ہو چکے دو سو برس ہے اب تو آزادی کا شوق
اب غلامی ہم نہیں کر سکتے انگلستان کی
صبح کو پڑھتے ہیں اللّٰھم شتت شملھم
صفحہ ہستی سے مٹے گی سلطنت یونان کی
جو لڑا ترکوں سے اس نے منھ کی کھائی چت ہوا
مٹ گئی ساری حکومت روس بے ایمان کی
جو مٹائے گا کسی کو خود ہی مٹ جائے گا
صاف کہتا ہوں ادبؔ جو بات ہے ایمان کی [۱۳۴]

مدرسۂ دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ اطراف ہند میں پہلے ہی موجود تھے اس کے علاوہ اس تحریک نے مولانا رشید احمد گنگوہی کے دور میں ہی کئی اسلامی ممالک میں اپنے سلسلۂ فیض کو پہنچانا شروع کر دیا تھا۔مدرسہ دیوبند کا پہلا دور جو رشید احمد گنگوہی کی وفات پر ختم ہوتا ہے صرف علمی تحریک کی توسیع اور مرکزی فکر کی حفاظت کے لیے مخصوص رہا۔ان کے بعد شیخ

الہند مولانا محمود الحسن نے علماء کو ایک اجتماعی طاقت کی حیثیت سے منظم کرنا شروع کیا جس کا اظہار تحریک ریشمی رومال اور پان اسلام ازم کی صورت میں ہمیں دکھائی دیتا ہے انھوں نے اس ضمن میں ہندوستان کی ان مسلم اکائیوں کو جو انگریزی تعلیم یافتہ تھیں اپنے تعلقات کو استوار کیا۔ اس سلسلے میں محمد علی جوہر، شوکت علی اور ڈاکٹر انصاری قابل ذکر ہیں۔ ان تعلقات کے استوار ہونے سے اسلامی ہند میں جو تفرقہ تعلیم یافتہ گروہوں اور مدرسوں کے مابین تھا اس میں کافی کمی واقع ہوئی اور ملت اسلامیہ منظم ہو کر ایک قیادت کے ماتحت اسلام کی بقا اور آزادی وطن کی جانب نہایت مضبوطی سے بڑھنے لگی۔

دولت عثمانیہ کے حق میں اور جنگ عظیم اوّل کے خلاف مولانا محمود الحسن کی مساعی اور ترکوں کی اعانت نے دیو بند تحریک کو سخت مشکلات میں مبتلا کر دیا تھا۔ چناں چہ اس جماعت کو مجبوراً اپنا مسلک بدلنا پڑا اور اس کو اسی میں عافیت نظر آئی کہ بین الاقوامی دائرے سے نکل کر ہندوستان کی آزادی کی خاطر جدوجہد کی جائے۔ اس خیال کے تحت مولانا محمود الحسن نے اپنی جماعت کو کانگریس میں شرکت کی اجازت دی۔ یہ واقعہ ۱۹۲۰ء کا ہے اور یہاں سے اسلامی ہند کی تاریخ میں دیو بند کے کردار کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے [۱۳۵]۔

ندوۃ العلماء:

جنوبی ایشیا انیسویں صدی کی نصف دہائی کے بعد تہذیبی اور شعوری سطح پر مسلمانوں کے جدید تصورات کا علمی لحاظ سے مقابلہ کرنے سے قاصر نظر آ رہا تھا۔ اس بات کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے چند علما پر مشتمل ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو ہندوستانی مسلمانوں میں کمزور اور قدیم طرز تعلیم کے نقائص کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور اس پر غور کر کے ان خامیوں کو دور کرنے کا خواہش مند بھی تھا۔ چناں چہ ہم خیال علما کا ایک طبقہ ۱۸۹۴ء میں اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے بیٹھا جس نے ندوۃ العلما کا نام اپنے لیے تجویز کیا۔ اس ادارے کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا کہ علی گڑھ اور قدیم علماء کے درمیان ایسا نصاب تشکیل دیا جائے جو ان میں دوریوں کو ختم کر دے [۱۳۶]۔

علما کرام کے حوالے سے یہ اعتراض عام تھا کہ معمولی مذہبی اختلافات اور جزئیات کی بنا پر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں، چناں چہ ندوہ نے اس نزاعی مسئلے پر بھی اتحاد بین المسلمین کی تحریک کو فروغ دیا اور مختلف الخیال علما کو ایسا مشترکہ لائحہ عمل دیا جو ہندوستانی مسلمانوں کی بہبود اور فلاح کے لیے تھا [۱۳۷]۔

یہ اغراض و مقاصد اتنے عمدہ تھے کہ اس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نواب محسن الملک اور وقار الملک نے بھی اسے پسند کیا اور تحریر و تقریر کے ذریعے اس کا خیر مقدم کیا۔ سرسید احمد خان نے ندوہ کے ناظم محمد علی کو ایک خط میں لکھا کہ ''ایک عمدہ کام ہوا ہے اس کو چلنے دینا چاہیے خدا اس کا نیک نتیجہ پیدا کرے۔۔۔۔ اگرچہ مجھ کو کچھ توقع نہیں ہے کہ باہم علما متفق ہوں۔ الّا کوشش ضرور ہو'' [۱۳۸]۔

اس ادارے کا تجربہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی اور مذہبی زندگی میں بڑا اہم ہے کیوں کہ یہاں سے فارغ التحصیل طالب

علموں کا ایک ایسا گروہ تیار ہوا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی ملّی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان اثرات کا جائزہ علمی، تہذیبی اور ثقافتی بنیادوں پر کیا جانا ضروری ہے مگر یہاں صرف اتحاد اسلامی کے تناظر میں اس ادارے کی خدمات کا جائزہ پیش کیا جائے گا تا کہ اس کے مقاصد میں شامل اس اہم ترین جزو کی تشریح ہو جائے۔

مولانا محمد علی کی صدارت میں حاجی محمد کفایت اللہ کے گھر میں ندوہ کے حوالے سے کانپور میں ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں صاحب الرائے علما نے چند تجاویز بہ غرض استصواب پیش کیں۔ اس میں ایک ایسی تجویز بھی شامل تھی جو اتحاد اسلامی کے لیے ناگزیر تھی۔ ندوہ کا مقصد یہ تھا کہ ایک جماعت ایسے علما کی بھی موجود ہونی چاہیے جو دور دراز ممالک اسلامیہ کا سفر کرے۔ وہاں کے مسلمانوں سے مل کر تبادلہ خیال کرے، اسلام کی اشاعت کی تدبیریں سوچیں کہ وہاں کے مفید تجربوں کو اپنے ملک میں دستور العمل بنائے، جہاں اسلام کی حکومت نہیں ہے وہاں وعظ کرے تا کہ اسلام کی اشاعت لوگوں میں ہو سکے[۱۳۹]۔

ندوہ کے پہلے ناظم محمد علی کانپوری مصر و قسطنطنیہ کا سفر کر چکے تھے وہاں کے تعلیمی رجحانات اور نصاب تعلیم کا مطالعہ کرنے کے بعد ندوۃ العلما میں اسے روبہ عمل لانے کی جستجو کرتے تھے انھوں نے اس دار العلوم کا جو خاکہ تیار کیا اس کو پڑھنے کے بعد لوگ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مصنف قسطنطنیہ میں کھڑا ہو کر مسلمانان ہند کی ذہنی آبیاری کا کام انجام دے رہا ہے[۱۴۰]۔

مولانا شبلی نعمانی بھی اس ادارے کے تاسیسی ارکان میں سے تھے مگر بعد میں اس ادارے سے اختلافات کی وجہ سے علیحدہ ہو گئے ان کا مضمون ندوۃ العلما کیا کر رہا ہے نہایت اہم ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے اس تعلیمی ادارے کی کوششوں کا جائزہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> بے شبہہ ندوہ کو جو کچھ کرنا چاہیے اس میں اس نے ابھی من میں چھٹا نک بھر بھی نہیں کیا لیکن جب یہ خیال کیا جائے کہ خود اسلامی سلطنتوں میں جہاں اسلام کی شاہنشاہی قائم ہے اس قسم کی کوششوں کا شائبہ تک نظر نہیں آتا جو کچھ اب تک ندوہ نے کیا اس کو کسی طرح نگاہ حقارت سے نہیں دیکھا جا سکتا[۱۴۱]۔

بہر حال اس ادارے نے مسلمانان ہند کے ملی مقاصد کی تکمیل میں اپنا کردار ادا کیا۔ اس کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمانوں میں گروہی عصبیت کم ہو گئی۔ اس تحریک کے ذریعے اعتدال پسندی کو فروغ ملا جس کی وجہ سے مسلمانوں کو باہم شیر و شکر ہونے کا موقع مل پایا۔ اتحاد بین المسلمین کو فروغ دینے کے علاوہ اسلام اور اسلامی تمدن و تاریخ پر جو داخلی اور خارجی حملے کیے جا رہے تھے ان کی روک تھام کے لیے اس ادارے نے کئی اہم علمی کام انجام دیے۔ یہ عمل ایسا احسن قدم تھا کہ جس نے نعرے بازی سے زیادہ دور رس اثرات مرتب کیے اور اس نے مستشرقین کے الزامات کو دلائل کے ذریعے رد کر دیا[۱۴۲]۔

ان ہی علما میں سید سلیمان ندوی بھی تھے جنھوں نے مستشرقین کے سوالوں کا جواب نہایت مدلل انداز میں دیا۔ اس کے علاوہ انھوں برعظیم کی سیاسی اور ملی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان کا مقالہ خلافت اور ہندوستان مسئلہ خلافت اور تیمور کے خاندان سے قبل ہندوستان کے تاریخی پہلوؤں کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا آغاز خلافت کی ابتدا سے ہوا ہے۔ مصر کی آخری عباسی خلافت میں ہندوستانی مسلمانوں کے کس طرح کے سفارتی تعلقات تھے اس کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالے کے دوسرے حصے میں انھوں نے خاندان آل عثمان اور ہندوستان کے مغل فرماں رواؤں کے مابین تعلقات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کا عثمانیوں کے ساتھ جو تعلق تھا وہ صرف سیاسی نہیں بلکہ اسلامی اور روحانی بھی تھا [۱۴۳]۔ ان کا کہنا ہے کہ:

> خلافت عثمانیہ کی مخالفت میں فتنہ پردازی کا آغاز جنگ روم و روس و یونان سے ہوا۔ چوں کہ اس وقت برطانیہ کی ہمدردی و اعانت یونان کے شامل حال تھی اس لیے مقربان بارگاہ کو حصول خوش نودی کی فکر ہوئی۔ سرسید اور ان کے ساتھ چند خطاب یافتوں نے انکار خلافت میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا [۱۴۴]۔

سید سلیمان ندوی چوں کہ ندوۃ کے فارغ التحصیل تھے اس لیے ان کی سوچ اور فکر میں کسی خاص مسلک کی ترقی و ترویج نہیں تھی۔ ندوہ کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے مسلکی بنیادوں پر اپنی درس گاہ کی بنیاد نہیں رکھی، یہی عمل اتحاد بین المسلمین کی علامت ہے۔ سید سلیمان ندوی بھی یہی چاہتے تھے کہ مسلمان خواہ کہیں کے بھی ہوں آپس میں ایک رشتہ باہمی سے جڑ کر ایسی حکمت عملی ترتیب دیں جو وقت اور حالات میں مسلمانوں کی درست سمت میں رہ نمائی کر سکے۔ ان کی تعلیمی خدمات میں یہ بات ضرور شامل تھی کہ طلبہ کو موجودہ زمانے کی قوموں اور دنیائے اسلام کے حالات اور سیاست سے باخبر کیا جائے۔ طلبہ میں یورپی زبانوں کے سیکھنے کی جستجو اور شوق پیدا کیا جائے تا کہ وہ مفتریوں کے لگائے گئے الزامات کا جواب دے سکیں [۱۴۵]۔

سید سلیمان ندوی کا علمی کارنامہ تحریک اتحاد اسلامی کے تصورات کے عین مطابق ہے۔ ۱۹۱۴ء میں جب وہ ابوالکلام آزاد کے الہلال کی مجلس ادارت میں شامل ہوئے تو انھوں نے کئی ایسے مضامین بھی لکھے جو برطانوی سامراج کے لیے کسی طور قابل قبول نہیں تھے۔ مثلاً ان کا مضمون مشہد اکبر الحریتہ الاسلام نے مسلمانوں میں ملی جوش و ولولے کو فروغ دیا [۱۴۶]۔

مشہد اکبر کی اشاعت پر اخبار کی ضمانت ضبط ہوگئی تھی۔ اس مضمون میں سید سلیمان ندوی کا انداز جارحانہ تھا وہ لکھتے ہیں کہ:

> زمین پیاسی ہے اس کو خون چاہیے لیکن کس کا؟ مسلمانوں کا۔ طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے؟

مسلمانوں کے۔ مغرب اقصا کس کے خون سے رنگین ہے؟ مسلمانوں کے۔ ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی۔ سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے؟ مسلمانوں کا۔ ہندوستان کی زمین بھی پیاسی ہے۔ خون چاہتی ہے؟ مسلمانوں کا؟ آخرکار سرزمین کان پور پر خون برسا اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی[۱۴۷]۔

سید سلیمان ندوی کے اس مضمون سے اور ان کی قومی خدمات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کبھی بھی اپنے نظریے کو کسی محدود علاقائی تصور کا پابند نہیں بنایا۔ اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ مسلمان برطانوی سامراج کی جڑوں کو کمزور کرنے کے لیے تاریخ نگاری کے ساتھ ساتھ تاریخ ساز سیاسی جدوجہد کو مزید تیز کر دیں تاکہ آزادی کا حصول ممکن ہو سکے۔

ان کے خطوط کا مجموعہ برید فرنگ بھی مسلمانوں کے ملی اور مذہبی احساس کی تفسیر ہے۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو لکھا گیا خط جس میں دنیائے اسلام کے سیاسی حالات کا محاکمہ کیا گیا ہے ان کے تصورِ ملت کا شاہد ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

مجھے یہاں آ کہ جس بات سے تسکین ہوئی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ترکی پھر سے جی اٹھے گا بلکہ اس سے ہوتی ہے کہ بوڑھے اسلام کے بجائے اب ایک نوجوان اسلام پیدا ہوتا میں دیکھ رہا ہوں۔ ممالک اسلامیہ کی حریت طلبی اور آزادی کے لیے سربکف کوششوں کے آثار صاف نظر آ رہے ہیں[۱۴۸]۔

دارالعلوم ندوہ سے رسالہ الندوہ میں انتخاب الاخبار کی تمام خبروں کا خلاصہ پیش کیا جاتا تھا۔ یہ خبریں زیادہ تر ممالک اسلامیہ کے بارے میں ہوتی تھیں۔ خاص کر ترک جس جنگی جنون کا شکار تھے ان خبروں پر رسالے کے مدیر تبصرہ بھی کیا کرتے تھے۔ الندوہ میں بلغاریوں اور ترکوں کے حوالے سے جاری ایک جنگ کی خبر پر سید سلیمان ندوی نے ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

ایک انگریز مسٹر بلنٹ نامی شخص نے ایک طویل مضمون میں اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ وزارت انگلستان ہی کی سازشوں سے اٹلی اور طرابلس پر دن دھاڑے عہد بین الاقوامی کی مٹی پلید کر کے ڈکیتی کی اور جب اس سے بھی مطلب نہ حاصل ہوا تو دول بلقان کو آمادہ جنگ کیا گیا[۱۴۹]۔

ہندوستان کی جتنی بڑی تحریکیں بیسویں صدی سے پہلے منظر عام پر آئیں ان میں اتحاد اسلامی کی تحریک کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ صرف ہندوستانی مسلمانوں نے اس تحریک کو کامیاب نہیں بنایا بلکہ انڈونیشیا اور ملائیشیا میں بھی وہی صورت حال تھی جو ہندوستان میں دیکھی گئی۔ لیکن ۱۸۷۰ء تک یہ تحریک صرف رجحان کی سطح پر تھی مگر اس کے بعد یہ ایک شعوری عمل بن کر پوری دنیا میں مسلمانوں کی یک جہتی کی علامت بن گئی۔ یہی وہ وقت تھا جب ترکوں کے خلیفہ نے مختلف دباؤ کے تحت جو فوجی، سیاسی اور معاشی تھے، مسلمانوں پر عمومی تسلط کا زیادہ گرم جوشی سے اظہار کرنا شروع کر دیا۔

چوں کہ مسلمانوں میں خلیفہ کی تعظیم پہلے ہی روحانی طور پر موجود تھی، اس عمومی دباؤ کے تحت انھوں نے دنیا کے مسلمانوں کو مرکز اسلامیہ کے تحت متحد ہونے کے لیے سیاسی لائحہ عمل بھی دیا اور ہر ملک کی اسلامی تحریکوں نے اس تحریک

میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔ ندوۃ العلما کے کئی طالب علم تو ایسے تھے جنھوں نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے کئی اہم علمی کام انجام دیے ان میں مولانا ابوالحسنات ندوی کا کام بھی غیر معمولی ہے۔

مولانا ابوالحسنات ندوی نے خلافت اسلامیہ اور ترک نامی ایک کتاب لکھی جس میں انھوں نے مسئلہ خلافت کے تاریخی اور سیاسی اہمیت پر بحث کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی حکومت کی یادگار یعنی ترکی میں تباہی و بربادی کے اصل محرکات کیا تھے؟ اور یہ بربادی تاریخ میں کن خامیوں کی وجہ سے ہو رہی ہے؟ پھر انھوں نے اس کتاب میں یہ بھی شواہد پیش کیے ہیں کہ ترکی خلیفہ کیوں اسلام میں مرکزی اہمیت کے حامل رہے ہیں اور ہندوستانیوں سے ان کا رشتہ کتنا قدیم ہے۔

اس کتاب سے یہ اندازہ با آسانی لگایا جا سکتا ہے کہ ندوۃ العلما کے طلبہ اور اساتذہ دونوں ترک خلیفہ کو خلیفہ اسلام تسلیم کرتے تھے۔ ابوالحسنات ندوی نے اس کتاب میں ایک ضمیمہ مسئلہ ترکی اور سول اینڈ ملٹری گزٹ پر شامل کیا ہے اس میں انھوں نے مختلف گزٹ کی مثالیں دے کر ترکی کو تقسیم کرنے کے یورپی منصوبوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس امر پر لوگوں کی توجہ مبذول کرائی تھی کہ کیوں ترکی نے برطانیہ سے دوستی چھوڑ کر جرمنی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مضمون خاصا طویل ہے مگر بہت زیادہ معلومات کا حاصل ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ترکی کے متعلق برطانیہ کا طرز عمل غیر دوستانہ ہو رہا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۱۴ء میں برطانیہ نے ترکی کے دوز یر تعمیر جہازوں پر قبضہ کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی نے برطانیہ کے بجائے جرمنی سے دوستی پیدا کی [۱۵۰]۔

دار العلوم ندوہ کی علمی، ادبی اور سیاسی خدمات کا اعتراف شبلی نعمانی نے بھی کیا ہے۔ اس ادارے میں مسلمانوں نے مذہبی احساس کو مٹنے نہیں دیا۔ شبلی یہ سمجھتے تھے کہ اگر ملک میں اس قسم کے مذہبی ادارے بند ہو جائیں گے تو مسلمانوں کی حریت اور شعوری فکر کی آبیاری ممکن نہیں رہے گی۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> جب مذہبی احساس فنا ہو جائے گا، جب انگریزی تعلیم مذہبی تعلیم کو بالکل دبا لے گی، جب ہر ہاتھ میں قرآن کے بجائے ڈارون اور ہکسلے کی تصنیفات ہوں گی، جب ایسے لوگ کثرت سے پیدا ہو جائیں گے کہ اگر کعبہ اور مدینہ پر کسی یورپین سلطنت کا قبضہ ہو جائے تو زیادہ بہتر ہو [۱۵۱]۔

شبلی کے یہ خیالات ٹھیک تھے اگر ندوہ اور مسلمانوں کے دیگر بڑے تعلیمی ادارے انیسویں صدی میں مذہبی اور سیاسی ہم آہنگی پیدا نہیں کرتے تو بچی کچھی جدوجہد بھی نابود ہو جاتی، اسی لیے شبلی نے ندوہ ہی کے جھونپڑے کو اپنے لیے موزوں قرار دیا تھا [۱۵۲]۔

حواشی:

۱۔ حسین، سید احتشام، ۱۹۵۳ء، علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلو، مشمولہ: 'علی گڑھ میگزین'، (علی گڑھ نمبر) علی گڑھ، ص ۱۷

۲۔ محمود، سید فیاض، بریلوی، عبادت، ڈاکٹر، فروری ۱۹۷۲ء، تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند، ۱۸۵۸ء۔ ۱۹۱۴ء، نویں جلد، 'اردو ادب' چہارم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ص ۱۲

۳۔ حسین، سید احتشام، ص ۲۵

۴۔ ایضاً، ص ۳۴

۵۔ فرید آبادی، ہاشمی، ۱۹۵۳ء، تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، جلد دوم، انجمن ترقی اردو پاکستان، ص ۴۸۱

۶۔ محمود، سید فیاض، بریلوی، عبادت، ڈاکٹر، ۱۶

۷۔ حسین، سید احتشام، ص ۳۴

۸۔ شاہ، محمد، ڈاکٹر، ۲۰۰۲ء، *Pan Islamism in India and Bangal*، رائل بک کمپنی، کراچی، ص ۵۵

۹۔ واسطی، سید تنویر، جولائی ۲۰۱۰ء، *Sir Syed Ahmed khan and the Turks*، مشمولہ: 'مڈل ایسٹرن اسٹڈیز'، فرینک کیس جرنل، جلد ۴۶، شمارہ نمبر ۴، لندن، ص ۵۳۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۵۳۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۳۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۳۵، ۵۳۶

۱۳۔ پانی پتی، اسماعیل، مولانا، دسمبر ۱۹۶۳ء، مقالاتِ سرسید، حصہ سیزدہم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص ۴۰۹

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۲۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۲۷، ۴۲۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۳۱

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۳۲

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۱۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۴۴۷

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۵۸

۲۱۔ ایضاً، ص ۴۲۹

۲۲۔ ایضاً، ص ۴۶۳

۲۳۔ واسطی، ص ۵۳۶؛ ترکی تنظیمات اس تحریک کا نام ہے جس کے اثرات سے ترکی میں کئی انقلابی تبدیلیاں برپا ہوئیں۔ اس تحریک نے جدید اسکولوں کی بنیاد ڈالی مگر پرانے مدرسوں کو جوں کا توں رہنے دیا۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: ترکی تعلیم، نومبر ۱۹۳۷ء، مشمولہ: 'جامعہ'، دہلی، جلد ۲۸، نمبر ۵، ص ۹۳۴، یہ مضمون 'ایشیاٹک ریویو' سے لیا گیا ہے مگر مصنف کا حوالہ اس میں موجود نہیں۔

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ سید تنویر واسطی کا یہ مضمون جس کا حوالہ اوپر درج ہے آزمی اوزکان کی کتاب سے لیا گیا ہے ان کے مقالے کے صفحہ ۵۴۲ میں یہ حوالہ موجود ہے۔ واسطی صاحب کا کہنا ہے کہ سید احمد خان کے کسی بھی ترکی ماخذ میں یہ حقائق پہلی بار پیش کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی اہم ہے کہ اردو میں بھی سید احمد خان اور ترکی وفد کی ملاقات کے حوالے سے میرے علم کے مطابق یہ حوالہ کہیں نہیں ملتا۔

۲۷۔ زبیری، محمد امین، س ن، مسلم یونی ورسٹی کی تاسیس اور اس کا تدریجی ارتقا، لیتھو پریس میکلوڈ روڈ، کراچی، ص ۲۱

۲۸۔ ایضاً

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ ایضاً

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ جعفری، سید رئیس احمد، علی برادران، جوہر اسپیشل نمبر علی برادران اکیڈمی، کراچی، ص ۱۴۳؛ عبدالرحمن صدیقی علی گڑھ کے ایک طالب علم ہی نہیں تھے انھوں نے مسلمانوں کی قومی زندگی میں سیاسی لحاظ سے کئی اہم کام انجام دیے۔ ترکوں کے ساتھ جنگ بلقان میں شریک ہو کر مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی ساکھ بنائی تھی۔ مسئلہ فلسطین کے حوالے سے انھوں نے یہ طے کیا کہ وہ جینیوا جائیں گے اور مجلس اقوام کے سیکریڑی جنرل سے ملاقات کریں گے اور انگریزوں کے مخالفت کریں گے۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: خلیق الزماں، چودھری، کاش وہ جانتے، کراچی۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۰۳؛ یہ خط عبدالرحمن صدیقی نے رسالہ ہمدرد میں لکھا تھا جسے سید رئیس احمد جعفری نے اپنے رسالے میں شائع کیا۔

۳۴۔ قیصر، رضوان، جنوری، فروری، مارچ، ۱۹۹۶ء، پان اسلامزم، ہندوستان کی جنگ آزادی اور مہاتما گاندھی، مشمولہ: 'جامعہ'، شمارہ ۱۔۲۔۳، جامعہ ملیہ، دہلی، ص ۱۷۳

۳۵۔ اشرف، محمد، ڈاکٹر، ۱۹۵۳ء، علی گڑھ کی سیاسی زندگی، مشمولہ: 'علی گڑھ میگزین'، (علی گڑھ نمبر)، شمارہ خصوصی، علی گڑھ، انڈیا، ص ۱۶۳

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۶۴

۳۷۔ ایضاً

۳۸۔ ایضاً

۳۹۔ عبدالمغنی، ستمبر ۱۹۶۰ء، شبلی و حالی کی تحریکیت، مشمولہ: 'ادیب' (شبلی نمبر)، شمارہ ۹ جلد ۶، علی گڑھ، ص ۲۵۹

۴۰۔ قیصر، ص ۱۷۴

۴۱۔ اشرف، ص ۱۲۴

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۶۵

۴۳۔ ایضاً

۴۴۔ جعفری، سید رئیس احمد، ص ۳۱۸

۴۵۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، ۲۰۰۸ء، اقبال اور جدید دنیائے اسلام، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ص ۱۴۵

۴۶۔ احمد، عزیز، جون ۲۰۰۵ء، برصغیر میں اسلامی کلچر، مترجم: جمیل جالبی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص ۹۴

۴۷۔ قریشی، اشتیاق حسین، جولائی ۱۹۹۴ء، علما میدان سیاست میں، ترجمہ: ہلال احمد زبیری، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونی ورسٹی، ص ۳۰۴

۴۸۔ اشرف، ص ۱۶۵

۴۹۔ قیصر، ص ۱۷۴

۵۰۔ ایضاً

۵۱۔ صدیقی، خلیق الزماں، اکتوبر ۱۹۶۷ء، شاہراہ پاکستان، انجمن اسلامیہ پاکستان، ص ۲۴۴

۵۲۔ فہد، عبداللہ، اگست ۱۹۸۹ء، مولانا ابو الکلام آزاد کے سیاسی افکار، مشمولہ: رسالہ 'فکر و نظر' (ابوالکلام آزاد نمبر)، علی گڑھ، ص ۱۵۱

۵۳۔ صدیقی، ص ۲۴۴

۵۴۔ ایضاً

۵۵۔ عبدالباری، سید، ڈاکٹر، ۱۹۸۶ء، ڈاکٹر سید محمود، مشمولہ: رسالہ 'فکر و نظر' (نامواران علی گڑھ نمبر)، دوسرا کاررواں، علی گڑھ، ص ۱۱۴

۵۶۔ ایضاً

۵۷۔ ایضاً

۵۸۔ ایضاً

۵۹۔ صدیقی، خلیق الزماں، ص ۲۵۵

۶۰۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ۱۹۹۸ء، سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۴۵

۶۱۔ منگلوری، سید طفیل، دسمبر ۱۹۴۵ء، مسلمانوں کا روشن مستقبل، حماد الکتبی۔ شیش محل روڈ، لاہور، ص ۲۸۸

۶۲۔ ایضاً، ص ۲۸۸، ۲۸۹

۶۳۔ عبدالباری، ص ۱۱۵

۶۴۔ ایضاً

۶۵۔ ایضاً

۶۶۔ صدیقی، خلیق الزماں، نومبر، ۱۹۶۵ء، کاش وہ جانتے، مستفیض احمد صدیقی پرو پرائٹر انٹرنیشنل پریس، کراچی، ص ۸

۶۷۔ عبدالباری، ص ۱۱۵

۶۸۔ او کے، میم کمال، اگست ۱۹۹۱ء، ص ۴۴

۶۹۔ صدیقی، خلیق الزماں، نومبر، ۱۹۶۵ء، ص ۱۶

۷۰۔ ایضاً

۷۱۔ ایضاً، ص ۱۷

۷۲۔ انصاری، اقبال، ڈاکٹر، ۱۹۸۶ء، ص ۲۴۹

۷۳۔ فریدی، قمر الہدیٰ، مولانا شوکت علی، ص ۲۴

۷۴۔ برنی، ضیاء الدین احمد، راجہ غلام حسین، ص ۵۱

۷۵۔ صدیقی، شاہراہ پاکستان، ص ۲۵۴

۷۶۔ صدیقی، رشید احمد، نیا دور، شمارہ نمبر ۵۷۔ ۵۸، ص ۲۵

۷۷۔ ایضاً

۷۸۔ قرآن حکیم، سورہ توبہ، آیت نمبر ۲۰

۷۹۔ میاں، سید محمد، مولانا، ستمبر ۱۹۴۶، ص ۱۲۷؛ ۱۲۹۵ھ میں ثمرۃ التربیت کا قیام دیو بند میں ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ عالم دین جو اس ادارے سے تعلیمی سرگرمیاں پوری کر چکے ہیں اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ ہیں ان پر اس مادرِ علمی کا بڑا حق ہے اس لیے

ان کو چاہیے کہ وہ سال میں کم از کم ایک بار اپنی ایک ماہ کی آمدنی کا چوتھائی حصہ دارالعلوم کو دیں۔مزید تفصیلات کے لیے دیکھیں، تاریخ دارالعلوم دیو بند نمبر ۱۹۸۰ء اشاعت خصوصی رسالہ'الرشید'، ساہیوال، پاکستان، ص ۷۱؛ مولانا محمود الحسن نے اسی ثمرۃ التربیت کو جمعیۃ الانصار میں تبدیل کر دیا۔ دیکھیں ماہنامہ الرشید، ۱۹۷۶ء، دارالعلوم دیو بند نمبر، لاہور

۸۰۔ ایضاً، ص ۱۲۹

۸۱۔ ایضاً، ص ۱۳۰

۸۲۔ واسطی، سید تنویر، س ن، ص ۱

۸۳۔ احمد، عزیز، جون ۱۹۹۷ء، ص ۱۹۳

۸۴۔ واسطی، ص ۱، ۲

۸۵۔ ابن الحاج، محمد رفیع، ۱۳۳۵ھ، ص ۱۷

۸۶۔ ایضاً، ص ۱۷

۸۷۔ میاں، سید محمد، مولانا، ستمبر ۱۹۴۶، ص ۱۳۰

۸۸۔ پانی پتی، اسمٰعیل، اکتوبر ۱۹۶۲ء، ص ۲۰۸

۸۹۔ واحدی، ملا، مئی ۱۹۶۸ء، ص ۳۵، ۳۶

۹۰۔ ایضاً، ص ۳۶

۹۱۔ عزیز الرحمن، مولانا، مفتی، اگست ۱۹۶۵ء، ص ۱۶۴

۹۲۔ تاریخ دارالعلوم دیو بند نمبر، ۱۹۸۰ء، مشمولہ: 'الرشید'، ساہیوال، ص ۸۴۔ ۸۵

۹۳۔ دارالعلوم دیو بند نمبر، فروری ۱۹۷۶ء، مشمولہ: 'الرشید'، لاہور، جلد ۲، ۳، ص ۲۳۵

۹۴۔ ایضاً، ص ۲۳۱

۹۵۔ ایضاً، ص ۲۳۳

۹۶۔ میاں، سید محمد، مولانا، ستمبر ۱۹۴۶، ص ۱۴۲

۹۷۔ ایضاً

۹۸۔ میاں، سید محمد، مولانا، ۱۹۹۱ء، ص ۸۱

۹۹۔ ایضاً

۱۰۰۔ میاں، سید محمد، مولانا، ستمبر ۱۹۴۶، ص ۱۴۲

۱۰۱۔ شاہ جہان پوری، ابوسلمان، ۱۹۸۸ء، ص ۴۴

۱۰۲۔ مدنی، حسین احمد، فروی ۲۰۰۷ء، ص ۶۳۷

۱۰۳۔ ایضاً، ص، ۶۴۷

۱۰۴۔ میاں، سید محمد، مولانا، ۱۹۹۱ء، ص ۱۹۱

۱۰۵۔ ایضاً، ص ۱۹۲

۱۰۶۔ ایضاً

۱۰۷۔ احمد، عزیز، ص ۱۹۳

۱۰۸۔ شاہ جہان پوری، ابوسلمان، ص ۲۲۳

۱۰۹۔ ایضاً، ص ۲۲۴
۱۱۰۔ احمد، عزیز، ص ۱۸۹
۱۱۱۔ ایضاً
۱۱۲۔ ایضاً
۱۱۳۔ عزیز، محمد، ۱۹۴۳، ص ۴۳۶
۱۱۴۔ عتیقی، حکیم عبدالمجید، س ن، ص ۱۱۳
۱۱۵۔ ایضاً
۱۱۶۔ شاہ جہان پوری، ابوسلمان، ۱۹۹۴ء، ص ۱۱۸
۱۱۷۔ ایضاً
۱۱۸۔ ایضاً
۱۱۹۔ ایضاً، ص ۱۱۹
۱۲۰۔ ایضاً
۱۲۱۔ قاسمی، انیس الاسلام، نومبر ۱۹۷۹ء، ص ۱۷
۱۲۲۔ شاہ جہان پوری، ابوسلمان، دسمبر ۱۹۱۸ء، ص ۴۲
۱۲۳۔ قاسمی، ص ۱۷
۱۲۴۔ بزم، عبدالصمد صبا، فروری ۱۹۷۶ء، ص ۳۰۳
۱۲۵۔ ایضاً
۱۲۶۔ مٹکاف، باربرا ڈی، (Babara Daly Metcalf) ۱۹۸۲، ص ۲۰۶
۱۲۷۔ ایضاً
۱۲۸۔ ایضاً، ص ۲۰۷
۱۲۹۔ ایضاً، ص ۲۰۹
۱۳۰۔ ایضاً، ص ۲۰۹، ۲۱۰
۱۳۱۔ صدیقی، ظہیر احمد، ڈاکٹر، اکتوبر ۲۰۱۰ء، ص ۶۳
۱۳۲۔ ایضاً، ص ۶۴
۱۳۳۔ ایضاً، ص ۵۵
۳۴۔ ایضاً، ص ۵۶
۱۳۵۔ سرور، محمد، پروفیسر، اکتوبر ۱۹۴۵ء، ۳۳۹
۱۳۶۔ اکرام، شیخ محمد، ۲۰۰۴ء، ص ۱۳۲
۱۳۷۔ منگلوری، سید طفیل احمد، نومبر ۱۹۳۷ء، ص ۲۱۱
۱۳۸۔ اکرام، ص ۱۳۲
۱۳۹۔ علی، محمد، مولانا، س ن، ص ۲
۱۴۰۔ تنہا، محمد یحییٰ، مولوی، ۱۹۲۸ء، ص ۲۱۶

۱۴۱۔ شبلی، علامہ، ۱۹۳۸ء، ص ۶۶
۱۴۲۔ ندوی، حافظ مجیب اللہ، مئی ۱۹۵۵ء، ص ۲۵۷
۱۴۳۔ ردولوی، خورشید نعمان، پروفیسر، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹۵
۱۴۴۔ ندوی، سید سلیمان، ۱۹۶۶ء، ص ۱۸۱
۱۴۵۔ دلی، شہباز حسین، ۱۹۸۸ء، ص ۱۶۳
۱۴۶۔ دسنوی، سید شہاب، ۱۹۸۶ء، ص ۱۴۸
۱۴۷۔ ندوی، سید سلیمان، ۱۹۵۷ء، ص ۱۱۹
۱۴۸۔ ______، ۱۹۹۷ء، ص ۱۲۷
۱۴۹۔ ______، ۱۹۱۲ء، ص ۳۱
۱۵۰۔ ندوی، ابوالحسنات، ۱۳۳۹ھ، ص ۹۷
۱۵۱۔ شبلی، ۱۹۳۸ء، ص ۱۱۷
۱۵۲۔ ایضاً، ص ۱۱۸

Abstract

This article aims at giving a comprehensive picture how three known projects such as Aligarh, DaarulUloom and NadwatulUlama paved the way for the Pan-Islamism among the Muslims of South Asia.The project of Pan-Islamism in South Asia influenced the Muslim community dreaming to rule the world. Sir Syed Ahmed Khan did really hard to support the project, on the other hand he was supporting the British rule.The article mentioned the role of the DaarulUloom in supporting the ideals of the Pan-Islamism. Many religious scholars hailing from the Deoband did much to produce huge body of literature in order to mobilize the public.The article reflected the very aspect of it. NadwatulUlama is one of the three crucial projects supporting the sentiments of the Pan-Islamism.

Keyword: Pan-Islamism, Islamic Projects, Aligarh, DaarulUloom, NadwatulUlama, Muslim Community of South Asia, body of literature produced for supporting Pan-Islamism